ذوالحجہ ۱۴۴۳ھ
جولائی ۲۰۲۲ء

ماہنامہ میثاق لاہور

یکے از مطبوعات
تنظیمِ اسلامی
بانی: ڈاکٹر اسرار احمدؒ

عشرۂ ذوالحجہ کی اہمیت وفضیلت
اور فلسفۂ قربانی

حافظ عاطف وحید

حکومت اور ریاست فوری طور پر
اللہ اور رسول ﷺ سے جاری جنگ ختم کریں

وفاقی شرعی عدالت کا سود کے خلاف 28 اپریل 2022ء کا فیصلہ خوش آئند اور قابل صد تحسین ہے۔ البتہ متبادل نظام کے قیام کے لیے 5 سال کا وقت دینا ناقابل فہم ہے‘ کیونکہ آئین کے آرٹیکل F-38 میں سودی نظام کے فوری خاتمہ کا تقاضا موجود ہے۔ علاوہ ازیں ہمارے آئین کا آرٹیکل 227 کسی ایسے قانون کی اجازت نہیں دیتا جو قرآن وسُنّت سے متصادم ہو۔ اب حکومت اور ریاست کی یہ آئینی ہی نہیں‘ دینی ذمہ داری بھی ہے کہ وہ فوری طور پر وفاقی شرعی عدالت کے اس فیصلے پر مرحلہ وار عمل درآمد کا آغاز کرتے ہوئے مملکتِ خداداد پاکستان کے معاشی نظام کو مکمل طور پر شریعت کے مطابق ڈھال دیں۔ یاد رہے کہ وفاقی شرعی عدالت نے 1991ء میں بینک کے سود کو ربا قرار دے کر اس کے حرامِ مطلق ہونے کا فیصلہ دیا تھا جس کی 1999ء میں سپریم کورٹ کے شریعت اپیلٹ بینچ نے بھی توثیق کر دی تھی‘ لیکن مختلف حیلے بہانوں سے 2022ء تک اس پر عمل درآمد نہ کیا گیا۔

وفاقی شرعی عدالت کے 28 اپریل 2022ء کے فیصلے کے مطابق:

1. یکم جون 2022ء تک لفظ interest اور اُس کے ہم وزن الفاظ و معانی کو ملکی قوانین سے حذف کیا جائے۔
2. 31 دسمبر 2022ء تک سود سے پاک معاشی نظام کی تشکیل کے لیے پارلیمان تمام ضروری قانون سازی مکمل کرے۔
3. پاکستان کے معاشی نظام کو مکمل طور پر سود سے پاک کرنے اور اسلامی نظامِ معیشت میں ڈھالنے کے لیے 5 سال کا جو وقت دیا گیا اُس پر فی الفور حقیقی عمل درآمد شروع کر دیا جائے۔

ہم حکومت پاکستان اور دیگر اداروں کو متنبہ کرتے ہیں کہ وہ فیڈرل شریعت کورٹ کے اس معرکۃ الآراء فیصلہ پر فوری طور پر عمل درآمد شروع کریں اور کسی نوع کے لیت ولعل سے کام نہ لیں اور نہ ہی فیصلہ کے خلاف اپیل میں جانے کی کوشش کریں۔

بحیثیت مسلمان ہم پر لازم ہے کہ اللہ اور رسول ﷺ سے جاری اس جنگ کو ختم کریں تاکہ ملک میں اللہ تعالیٰ کی رحمتیں نازل ہوں اور ہماری دنیا کے ساتھ آخرت بھی سنور جائے۔

نوٹ: تفصیلات کے لیے www.giveupriba.com وزٹ کیا جا سکتا ہے۔

بانی تنظیم: ڈاکٹر اسرار احمد رحمہ اللہ

امیر تنظیم: شجاع الدین شیخ حفظہ اللہ

مرکز تنظیم اسلامی، 23 کلومیٹر، ملتان روڈ، چوہنگ لاہور

فون: 78-35473375 (042)

Email:markaz@tanzeem.org
www.tanzeem.org

وَاذْكُرُوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَمِيْثَاقَهُ الَّذِيْ وَاثَقَكُمْ بِهٖٓ ۙ اِذْ قُلْتُمْ سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا ۡ (المائدۃ:۷)

ترجمہ: اور اپنے اوپر اللہ کے فضل اور اس کے میثاق کو یاد رکھو جو اس نے تم سے لیا جبکہ تم نے اقرار کیا کہ ہم نے مانا اور اطاعت کی!

ماہنامہ میثاق لاہور

اجرائے ثانی

ڈاکٹر اسرار احمد رحمۃ اللہ علیہ

جلد : 71

شمارہ : 7

ذوالحجہ 1443ھ

جولائی 2022ء

فی شمارہ : 40 روپے

سالانہ زرِتعاون: 400 روپے

مُدیر

حافظ عاکف سعید

مجلس ادارت:

ایوب بیگ مرزا، خورشید انجم

نائب مُدیر

حافظ خالد محمود خضر

ادارتی معاون:

حافظ محمد زاہد، محمد خلیق

مکتبہ خدام القرآن لاہور

مقامِ اشاعت: 36۔ کے ماڈل ٹاؤن، لاہور 54700، فون: 3-35869501

فیکس: 35834000، ای میل: maktaba@tanzeem.org

ترسیلِ زر: مکتبہ مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور

رابطہ برائے ادارتی امور: (042)38939321

publications@tanzeem.org

ویب سائٹ: **www.tanzeem.org**

مرکزی دفتر تنظیمِ اسلامی: ”دارُالاسلام“ ملتان روڈ چوہنگ لاہور

(پوسٹل کوڈ 53800) فون: 78-35473375(042)

پبلشر: ناظم مکتبہ مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور

طابع: رشید احمد چوہدری مطبع: مکتبہ جدید پریس (پرائیویٹ) لمیٹڈ

مشمولات

عرضِ احوال ———— 5

سیاسی بحران میں دینی جماعتوں کے لیے راستہ — ادارہ

بیانُ القُرآن ———— 9

سورۃ المنافقون — ڈاکٹر اسرار احمدؒ

حکمت و اَحکامِ دین ———— 26

عشرۂ ذوالحجہ کی اہمیت وفضیلت اور فلسفۂ قربانی — حافظ عاطف وحید

حسنِ معاشرت ———— 51

معذور افراد کے حقوق — احمد علی محمودی

معرکۂ روح و بدن ———— 61

فتنۂ دجّال اور پیش آمدہ چیلنجز (۲) — آصف حمید

انوارِ ھدایت ———— 70

ربوبیتِ ربّ — پروفیسر محمد یونس جنجوعہ

علومِ قرآنی ———— 73

علمِ تفسیر کی ضرورت واہمیت — پروفیسر حافظ قاسم رضوان

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ ○

سیاسی بحران میں دینی جماعتوں کے لیے راستہ

ایک مسلمان کا بنیادی فریضہ ہے کہ وہ حق کے ساتھ کھڑا ہو جائے اور باطل کا نہ صرف انکار کرے بلکہ ہر برائی کے خلاف ڈٹ کر کھڑا ہو جائے‘ کیونکہ یہی کلمۂ طیبہ کا بنیادی عملی تقاضا ہے جس کے ذریعے پہلے بندہ ہر باطل کی نفی کرتا ہے اور اس کے بعد اللہ پر ایمان لاتا ہے۔ اسی کلمۂ طیبہ کے دوسرے حصے میں جس رسول معظم ﷺ پر ایمان لا کر ہم مسلمان ہو جاتے ہیں اُنہی کا فرمان ہے کہ: ((مَنْ رَاٰی مِنْکُمْ مُنْکَرًا فَلْیُغَیِّرْہُ بِیَدِہٖ، فَاِنْ لَمْ یَسْتَطِعْ فَبِلِسَانِہٖ، فَاِنْ لَمْ یَسْتَطِعْ فَبِقَلْبِہٖ، وَذٰلِکَ اَضْعَفُ الْاِیْمَانِ)) (صحیح مسلم) ’’تم میں سے جو کوئی کسی منکر کو دیکھے اس کا فرض ہے کہ اسے زورِ بازو سے روک دے۔ پس اگر اس کی طاقت نہیں ہے تو زبان سے روکے۔ پھر اگر اس کی بھی ہمت نہیں ہے تو دل میں برائی سے نفرت ضرور رکھے۔ اور یہ ایمان کا کمزور ترین درجہ ہے‘‘۔ صحیح مسلم ہی کی دوسری روایت میں ہے کہ: ’’اگر دل میں بھی منکر (برائی) کے خلاف نفرت نہ ہو تو ((وَلَیْسَ وَرَاءَ ذٰلِکَ مِنَ الْاِیْمَانِ حَبَّۃُ خَرْدَلٍ)) ’’اس کے بعد تو رائی کے دانے کے برابر بھی ایمان نہیں ہے۔‘‘

امر بالمعروف ونہی عن المنکر ایمان کا ایسا بنیادی اور لازمی تقاضا ہے جس کے بغیر باایمان اور اُمتی ہونے کا دعویٰ سچا ثابت ہو ہی نہیں سکتا۔ ظاہر ہے جب معاشرے میں کسی بُرائی کو بُرا بھی نہ محسوس کیا جانے لگے تو سمجھ لیجیے کہ ایمان ختم ہو گیا ہے۔ اس کے بعد وہ معاشرہ اور اس کے لوگ ابلیس اور ابلیسی قوتوں کے رحم وکرم پر ہوں گے۔ اب وہ جو چاہیں ان کے ساتھ کھلواڑ کریں اور جس طرح چاہیں ان کو اپنے مقاصد کے لیے استعمال کریں۔

ہمارا یہ ملک جو اسلام کے نام پر بنا تھا آج ابلیسی قوتوں کے رحم وکرم پر ہے۔ شدید معاشی اور سیاسی بحران ہے۔ سودی قرضوں میں جکڑے ہونے کی وجہ سے ہمارے ایٹمی اثاثے‘ قومی سلامتی اور خودمختاری سمیت ہر چیز خطرے میں ہے۔ ملک اس حالت کو کیونکر پہنچا؟ اس کی ہزار ہا وجوہات گنوائی جاسکتی ہیں‘ لیکن اس تباہی کا اصل ذمہ دار صرف ایک طبقہ کو ہی قرار دیا جاسکتا ہے جو کہ حکومت میں رہا۔ حکمرانوں میں سے بھی فوجی حکمرانوں سے جمہوری اور سول حکمران اس تباہی کے زیادہ ذمہ دار ہیں جو حکومتوں میں آنے کے لیے IMF کی شرائط پر معاہدے کرتے رہے‘ عالمی مالیاتی اداروں کی ڈکٹیشن پر ملک دشمن پالیسیاں بناتے رہے‘ اپنی پارٹیوں کے لیے بیرونی فنڈنگ حاصل کرتے رہے اور اقتدار

حاصل کرنے اور کرسی بچانے کے لیے بیرونی آقاؤں کا ہر حکم مانتے رہے اور اس طرح ملک کو تباہی کے کنارے تک پہنچا دیا۔

بیرونی آقاؤں کی غلامی اور باطل سے گٹھ جوڑ کا دوسرا پہلو بھی ملاحظہ فرمائیے جو کہ نہ صرف ہماری دنیوی تباہی کا باعث بنا بلکہ ہمارے ایمان‘ نظریۂ پاکستان اور اسلام کے لیے بھی مہلک ثابت ہوا۔ وہ یہ کہ بظاہر عوام کو دھوکہ ہے کہ قانون سازی عوام کے نمائندے کرتے ہیں‘ لیکن اگر عوام کے نمائندے بھی کوئی ایسی قانون سازی کریں جو اللہ کے حکم کے منافی ہو اور اللہ کے حکم کو چھوڑ کر اس قانون کو فالو کیا جائے تو یہ بھی باطل کی پرستش کے مترادف ہے۔ مگر یہاں حقیقت کچھ اور بھی ہے جس کا اعتراف ’’ابلیس کی مجلسِ شوریٰ میں‘‘ خود لشکر ابلیس کر رہا ہے ؎

ہم نے خود شاہی کو پہنایا ہے جمہوری لباس
جب ذرا آدم ہوا ہے خود شناس و خود نگر
تُو نے کیا دیکھا نہیں مغرب کا جمہوری نظام
چہرہ روشن‘ اندروں چنگیز سے تاریک تر!

حقیقت میں قانون سازیاں بھی کسی اور کی ڈکٹیشن پر ہوتی رہیں۔ ۱۹۶۱ء میں پاکستان میں عائلی قوانین پاس ہوئے۔ اس کا پس منظر یہ تھا کہ پاکستان کے تیسرے وزیر اعظم محمد علی بوگرہ نے ۱۹۵۵ء میں اپنی سیکرٹری عالیہ سیدی سے شادی کر لی۔ اس شادی کو بنیاد بنا کر حقوقِ نسواں کی تنظیم APWA نے محمد علی بوگرہ کے گھر کے سامنے احتجاج شروع کیا اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے خواتین کا یہ احتجاج ملک گیر حیثیت اختیار کر گیا۔ حالانکہ ان کا جو مطالبہ تھا وہ شریعت سے متصادم ہی نہیں بلکہ صریحاً خلاف تھا۔ مطالبہ یہ تھا کہ ایک سے زیادہ شادیوں پر پابندی عائد کی جائے‘ حالانکہ اسلام مردوں کو چار شادیوں کی اجازت دیتا ہے‘ لیکن اللہ کے حکم کی بجائے APWA کی بات مانی گئی‘ کیونکہ اپوا کے پیچھے باطل کا خفیہ ہاتھ تھا۔ اس تحریک کے دباؤ میں آ کر حکومت نے ۴/اگست ۱۹۵۵ء کو سات رکنی کمیشن بنایا جس میں اپوا کی نمائندہ خواتین بھی شامل تھیں۔ اندازہ کیجیے کہ کمیشن کے زیادہ تر ممبران نے اسلام کی بجائے ترکی اور تنزانیہ کو مثال کے طور پر پیش کیا کہ وہاں پہلی بیوی کی موجودگی میں دوسری شادی پر مکمل پابندی کا قانون موجود ہے۔ اس کمیشن نے جو سفارشات پیش کیں ان پر علماء اور دینی جماعتوں نے بھی اعتراضات اٹھائے مگر سب مخالفتوں کے باوجود مارچ ۱۹۶۱ء میں عائلی قوانین مجریہ ۱۹۶۱ء منظور اور لاگو ہو گئے۔ اس قانون کے مطابق دوسری شادی کے لیے پہلی بیوی کا اجازت نامہ مصالحتی کونسل میں جمع کرانا لازم ہے۔ مصالحتی کونسل دونوں پارٹیوں کو طلب کر کے سنے گی‘ اس کے بعد اگر وہ مناسب سمجھے گی تو مرد کو دوسری شادی کی اجازت دے گی‘ ورنہ آدمی دوسری شادی نہیں کر سکتا۔ اگر کرے گا تو پہلے بیوی کو فوری بقایا مہر‘ مہر غیر معجّل ادا کرے گا۔ سونے پر سہاگہ یہ کہ اگر آپ پہلی بیوی سے اجازت نہیں

لیتے تو قانون کے مطابق آپ کو ایک سال تک قید کی سزا اور ۵ لاکھ تک جرمانہ ہو سکتا ہے‘ جیسا کہ کچھ عرصہ قبل لاہور کے ایک رہائشی کو ۱۱ ماہ قید اور ۲ لاکھ ۲۵ ہزار روپے جرمانے کی سزا سنائی گئی۔

۲۴/نومبر ۲۰۱۶ء کو سندھ اسمبلی میں Criminal Law (Protection of Minorities Act) کا بل پیش کیا گیا۔ اس بل کے مطابق ۱۸ سال سے کم عمر کوئی شخص بھی اسلام قبول نہیں کر سکتا۔ اگر کرے گا بھی تو ۱۸ سال کی عمر کو پہنچنے تک وہ سرکار کے ریکارڈ میں غیر مسلم ہی رہے گا۔ ۱۸ برس سے زائد عمر کا شخص اگر اسلام قبول کرے گا تو وہ ۲۱ دن تک اسلام قبول کرنے کا اعلان نہیں کر سکتا۔ اس دوران اسے ’’سیف ہاؤس‘‘ میں مقید رکھا جائے گا۔ اس کا مقدمہ عدالت میں چلے گا اور عدالت اس شخص کو سمجھانے بجھانے کے لیے اس کے غیر مسلم والدین‘ دوستوں‘ رشتے داروں اور مذہبی پنڈتوں کو بھی بلائے گی جو اُسے اسلام قبول کرنے سے روکنے کے لیے سمجھائیں بجھائیں گے‘ معاشرتی دباؤ ڈالیں گے۔ اگر کوئی میاں بیوی اسلام قبول کر لیں گے تو ان کے بچے اٹھارہ سال کی عمر تک غیر مسلم ہی تصور کیے جائیں گے۔ انہیں اس عمر سے پہلے اسلام لانے کی اجازت نہیں ہوگی۔ اگر والدین بچوں کو اسلام قبول کرنے پر زور دیں گے تو یہ جرم ہوگا۔ اس بل کے پیچھے بھی این جی اوز کی تحریک تھی اور پیپلز پارٹی کی قیادت نے بھرپور سرگرمی دکھاتے ہوئے صوبائی معاون کے ذریعے بل اسمبلی میں پیش کیا جسے سرکاری ارکان نے سات منٹ کے اندر منظور کر لیا۔ تحریک انصاف‘ مسلم لیگ (ن)‘ ایم کیو ایم سمیت کسی جماعت نے بل کی مخالفت نہیں کی اور نہ ہی اس میں کوئی ترمیم پیش کی۔ اس موقع پر صوبائی وزیر نثار کھوڑو نے ایکٹ کی منظوری کے بعد ایوان میں موجود تمام ارکان کو مبارک باد پیش کی۔ اگرچہ اس وقت کے گورنر سندھ نے اس بل پر دستخط نہیں کیے‘ یوں یہ بل عملی شکل اختیار نہیں کر سکا۔

سندھ اسمبلی میں اس بل کی منظوری میں ناکامی کے تقریباً پانچ برس بعد ایک بار پھر اس مسترد بل کو قانون بنانے کی کوشش وفاقی سطح پر کی گئی۔ اگست ۲۰۲۱ء میں تحریک انصاف کی حکومت Prohibtion of Forced Religious Conversion Bill2021 کے نام سے اسی بل کا چربہ لے کر آئی۔ ۲۴/اگست ۲۰۲۱ء کو حکومت نے کچھ علماء اور اسلامی نظریاتی کونسل کا ایک ان کیمرا اجلاس منعقد کیا اور اس میں اس بل کو پیش کیا۔ اسلامی نظریاتی کونسل اور علماء نے اس بل کی شدید مخالفت کی جس کے نتیجہ میں بالآخر ۱۳/اکتوبر ۲۰۲۱ء کو پارلیمنٹ کی قائمہ کمیٹی نے اس بل کو مسترد کر دیا۔ لیکن آپ اندازہ کیجیے کہ سندھ اسمبلی نے اسی بل کو متفقہ طور پر پاس کر دیا تھا۔ بحیثیت مسلمان ہمیں سوچنا چاہیے کہ ہم اللہ کے حکم کی پیروی کر رہے ہیں یا پھر باطل کی پیروی کر رہے ہیں!

جنرل پرویز مشرف کے دور میں توہین رسالت قانون کو معطل رکھا گیا۔ جون ۲۰۰۴ء میں اسلام آباد میں ایک سیمینار میں اُس نے کہا تھا کہ وہ حدود آرڈیننس اور توہین رسالت پر موت کی سزا کے قانون پر نظر ثانی کے حق میں ہے اور اس مقصد کے لیے ایک کمیشن قائم کیا جائے گا۔ اُس کے دور میں

قومی اسمبلی میں ’’تحفظِ حقوقِ نسواں بل‘‘ کے عنوان سے حدود آرڈیننس میں ترامیم کا جو مسودہ پیش ہوا‘ اس میں سب سے زیادہ زنا سے متعلق قوانین کو نشانہ بنایا گیا اور ایسی قانونی موشگافیاں پیدا کی گئیں کہ اب زنا کے کیس میں مجرم آسانی سے بَری ہو جائیں گے۔ اس کے علاوہ حدودِ شرعیہ کے قوانین کے دیگر قوانین پر بالاتر ہونے کی دفعہ ہی حذف کر دی گئی اور بہت سی دیگر ایسی ترامیم بھی نئے مسودہ میں شامل کی گئیں جو حدود آرڈیننس کو کلیتاً غیر مؤثر بنانے کے علاوہ اور کوئی افادیت نہیں رکھتیں‘ جس کا واضح مطلب ہے کہ شرعی قوانین اب ملکی آئین میں کوئی معنی نہیں رکھتے۔ اسی طرح صوبہ سرحد میں متحدہ مجلس عمل کی جانب سے شریعت کے نفاذ کے لیے ۲۰۰۳ء میں ’’حسبہ بل‘‘ پیش کیا گیا تو وفاقی حکومت کی طرف سے اسے چیلنج کیا گیا۔ چیف جسٹس افتخار محمد چودھری نے اسے غیر آئینی قرار دے کر منسوخ کر دیا۔

سابق وزیر اعظم نواز شریف نے انتخابی اصلاحات بل ۲۰۱۷ء میں ترمیم کے ذریعے‘ کاغذاتِ نامزدگی میں ختم نبوت پر یقین کے حلف نامے کو اقرار نامے میں تبدیل کر دیا‘ جس کا واضح مطلب تھا کہ اگر کوئی جھوٹے نبیوں کا پیروکار اقرار نامے میں خود کو مسلمان ظاہر کر کے الیکشن لڑے یا کسی اعلیٰ عہدے پر پہنچ جائے اور بعد ازاں اس کا جھوٹ پکڑا بھی جائے تو اُسے کوئی سزا نہیں ہوگی‘ کیونکہ پاکستان کے آئین میں سزا حلف نامہ کی خلاف ورزی پر ہوتی ہے‘ اقرار نامہ کی خلاف ورزی پر کوئی سزا نہیں ہوتی۔ یہ سازش سامنے آنے پر قوم کے زبردست احتجاج اور سخت عوامی ردِّعمل کی وجہ سے نواز حکومت کو ختم نبوت کے قانون کو سابقہ حالت میں بحال کرنا پڑا۔

وقف املاک بل ۲۰۲۰ء میں منظور کیا گیا۔ اس بل میں قرار دیا گیا ہے کہ وفاق کے زیرِ انتظام علاقوں میں مساجد‘ مدارس‘ امام بارگاہوں کے لیے وقف زمین کے جملہ تصرفات کا انتظام حکومتی نگرانی میں چلے گا۔ اس قانون کے ذریعے دین اور دینی شعائر سے ناآشنا انتظامیہ کو دینی مراکز پر تسلط دینا درحقیقت دینی مراکز کی تباہی اور بربادی کی کوشش ہے۔

۲۱ جون ۲۰۲۱ء کو پاکستان کے ایوان بالا میں تمام سیاسی جماعتوں نے اپنے باہمی اختلافات یکسر بھلا کر کے گھریلو تشدد کی روک تھام کا بل منظور کیا۔ اس قانون کے تحت گھر کے کسی بھی ناراض شخص کو عدالت میں درخواست دینے کا حق حاصل ہے۔ فرض کریں اگر بیوی اور شوہر کا جھگڑا ہو جائے تو بیوی کی درخواست پر عدالت اسے دار الامان میں بھیج دے گی۔ عدالت یہ حکم بھی جاری کر سکے گی کہ ملزم درخواست گزار سے براہِ راست یا موبائل پر بات چیت بھی نہیں کر سکتا۔ ایسے ملزم کو درخواست گزار سے دور رکھنے کے لیے اُس کے ہاتھ میں ایک کڑا پہنا دیا جائے گا جس میں ایک جی پی ایس ٹریکر لگا ہوگا تاکہ علم ہو سکے کہ ملزم کہیں عدالت کے حکم کی خلاف ورزی تو نہیں کر رہا۔ عدالت اپنے احکامات کی نگرانی کے لیے علاقے کے تھانے کے ایس ایچ او کی ذمہ داری لگا سکتی ہے۔ (باقی صفحہ 82 پر)

دورۂ ترجمۂ قرآن

ڈاکٹر اسرار احمد

سُوْرَۃُ الْمُنٰفِقُوْن

تمہیدی کلمات

زیر مطالعہ مدنی سورتوں کے گروپ میں چوتھا جوڑا سورۃ المنافقون اور سورۃ التغابن پر مشتمل ہے۔ ان میں سورۃ المنافقون کے آغاز میں تسبیح کا ذکر نہیں ہے جبکہ سورۃ التغابن کا آغاز تسبیح سے ہو رہا ہے۔ جہاں تک ان سورتوں کے مضامین کا تعلق ہے' سورۃ المنافقون میں نفاق اور منافقین کا تذکرہ ہے' جبکہ سورۃ التغابن کا بنیادی موضوع ایمان ہے۔ جیسا کہ قبل ازیں بھی وضاحت کی جا چکی ہے' قرآن مجید کے وہ موضوعات جو طویل سورتوں میں تفصیل سے بیان ہوئے ہیں ان کا خلاصہ مختصر سورتوں میں دے دیا گیا ہے۔ نفاق اور ایمان کا تعلق بھی ایسے ہی موضوعات سے ہے۔ نفاق کا ذکر تمام مدنی سورتوں میں ملتا ہے' کہیں ڈھکے چھپے انداز میں اور کہیں کھلم کھلا۔ سورۃ النساء اور سورۃ التوبہ میں یہ موضوع اس لحاظ سے خصوصی طور پر نمایاں ہے۔ اسی طرح ایمان کا موضوع پورے مکّی قرآن میں پھیلا ہوا ہے' بلکہ اس بحث کے خاص خاص نکات کہیں کہیں مدنی سورتوں کے اندر بھی آ گئے ہیں۔ جیسے سورۃ البقرۃ کی آیت الآیات (آیت ۱۶۴) اور آیت الکرسی (آیت ۲۵۵) اس موضوع پر انتہائی جامع آیات ہیں۔ اس حوالے سے زیر مطالعہ دو سورتوں کی اہمیت یہ ہے کہ ان میں قرآن مجید کے ان دو اہم موضوعات پر طویل بحثوں کا خلاصہ سمو دیا گیا ہے۔ چنانچہ یہ دونوں سورتیں اپنے اپنے موضوع پر قرآن کی جامع ترین سورتیں ہیں۔

اس سورت کے باقاعدہ مطالعہ سے پہلے نفاق کے بارے میں چند اہم نکات کا تذکرہ ضروری ہے۔ یہ نکات اگرچہ قبل ازیں بھی کئی مرتبہ زیر بحث آ چکے ہیں' لیکن موضوع کے حوالے سے یہاں انہیں ایک مرتبہ پھر سے دُہرا لینا مفید رہے گا۔ اس ضمن میں پہلی بات تو یہ ہے کہ بنیادی

طور پر نفاق کی دو قسمیں ہیں: شعوری نفاق اور غیر شعوری نفاق۔ شعوری نفاق یہ ہے کہ کوئی شخص سوچے سمجھے منصوبے کے تحت اہلِ ایمان کو دھوکہ دینے کے لیے ایمان کا اقرار کرے۔ ایسا شخص تو گویا شروع سے ہی منافق ہے اور اسے ایک لمحے کے لیے بھی ایمان نصیب نہیں ہوا۔ ایسے منافقین کا ذکر سورۂ آل عمران کی آیت ۷۲ میں آیا ہے۔ وہ لوگ باقاعدہ ایک سازش کے تحت صبح کے وقت ایمان لانے کا ڈھونگ رچاتے تھے اور شام کو اسلام سے پھر جانے کا اعلان کر دیتے تھے' تاکہ اسلام کی ساکھ کو نقصان پہنچا سکیں۔ ظاہر ہے ان کے دلوں میں تو ایمان ایک لمحے کے لیے بھی داخل نہیں ہوتا تھا۔ ایسے لوگوں کی کیفیت سورۃ المائدۃ کی آیت ۶۱ میں یوں بیان کی گئی ہے: ﴿وَقَدْ دَّخَلُوْا بِالْكُفْرِ وَهُمْ قَدْ خَرَجُوْا بِهٖ ؕ﴾ کہ وہ کفر کے ساتھ اسلام میں داخل ہوئے اور کفر کے ساتھ ہی نکل گئے۔ بہرحال یہ شعوری نفاق کی مثال ہے۔ عملی طور پر اس قسم کے منافقین بہت کم پائے جاتے تھے۔

اس کے برعکس غیر شعوری نفاق کی مثال یوں سمجھیں کہ ایک شخص کے پاس اسلام کی دعوت پہنچی۔ اُس کے دل نے اس کی تصدیق کی اور وہ اس دعوت پر لبیک کہتے ہوئے ایمان لے آیا۔ لیکن بنیادی طور پر وہ چونکہ ایک کم ہمت شخص تھا' اس لیے ایمان کے عملی تقاضے پورے کرنے اور انقلاب کے راستے کی آزمائشوں کا سامنا کرنے سے گھبراتا رہا۔ خاص طور پر جب باقاعدہ تصادم کا مرحلہ آیا اور اہلِ ایمان سے تقاضا ہوا کہ وہ اپنی نقدِ جان ہتھیلی پر رکھ کر میدان میں آ جائیں تو ایسے کمزور لوگوں کی جان پر بن گئی۔ اب ان میں سے کچھ لوگ تو اپنی کم ہمتی کے باوجود بھی سچے دل سے مسلمانوں کے ساتھ چمٹے رہے۔ اس طرح کہ کبھی کوئی اچھا کام کر لیا تو کبھی کوئی نافرمانی بھی ہو گئی۔ کبھی کسی تقاضے پر لبیک بھی کہہ لیا تو کہیں بہانہ بنا کر کھسک بھی گئے' لیکن جب جوابدہی ہوئی تو اپنی غلطی کو تسلیم کر کے خود کو سزا کے لیے پیش کر دیا۔ سورۃ التوبہ میں ایسے لوگوں کے کردار کی کیفیت ﴿خَلَطُوْا عَمَلًا صَالِحًا وَّاٰخَرَ سَيِّئًا ؕ﴾ (آیت ۱۰۲) کے الفاظ میں بیان کی گئی ہے۔ جن لوگوں کا معاملہ یہیں تک رہا کہ ان سے جب بھی کوئی کوتاہی ہوئی انہوں نے صاف گوئی سے اسے تسلیم کر لیا اور کوئی بہانہ نہ بنایا تو وہ نفاق سے بری رہے۔ ایسے لوگوں کے بارے میں زیادہ سے زیادہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ وہ ضعفِ ایمان کے درجے میں تھے۔

البتہ ایسے معاملے میں اکثر انسان کی نام نہاد عزّتِ نفس آڑے آ جاتی ہے: ﴿وَاِذَا قِيْلَ لَهُ اتَّقِ اللّٰهَ اَخَذَتْهُ الْعِزَّةُ بِالْاِثْمِ﴾ (البقرۃ:۲۰۶) یعنی جب انسان کو اللہ سے ڈرنے کا

کہا جاتا ہے تو اس کی عزّتِ نفس کی عصبیت اسے نافرمانی کی طرف گھسیٹ لے جاتی ہے‘ کہ دیکھو تم ایک عزّت دار آدمی ہو‘ اپنی زبان سے خود ہی اپنی غلطیاں تسلیم کر کر کے کب تک لوگوں کی نظروں میں ذلیل ہو گے؟ بس بہت ہو گئی‘ اب اس کے بعد یہ نہیں چلے گا! چنانچہ جو شخص اپنے نفس کے اس بہکاوے میں آ کر خدا خوفی کی حد پار کر گیا اور اپنی غلطیاں چھپانے کے لیے جھوٹے بہانوں پر اُتر آیا اُس نے گویا نفاق کی سرحد میں پہلا قدم رکھ دیا۔ بس یہ پہلا قدم رکھنے کی ہی دیر تھی‘ اب یوں سمجھئے کہ وہ جھوٹ کی دلدل میں پھنس گیا۔ اس کے بعد وہ جو قدم بھی اٹھائے گا وہ اس کے لیے اس دلدل میں مزید نیچے دھنستے جانے کا ہی سبب بنے گا۔ صبح جھوٹ‘ دوپہر جھوٹ‘ شام جھوٹ‘ بلکہ بات بات پر جھوٹ۔ پھر ایسا شخص جب دیکھتا ہے کہ اس کے جھوٹ بولنے اور جھوٹے بہانے بنانے پر لوگ معنی خیز انداز میں مسکراتے ہیں تو وہ اپنے جھوٹے بہانوں کو سچا ثابت کرنے کے لیے جھوٹی قسموں کا سہارا لینا شروع کر دیتا ہے۔ اگر نفاق کے مرض کو ٹی بی کے مہلک مرض سے تشبیہہ دیں تو قسموں کے اس مرحلے سے جان لینا چاہیے کہ اب متعلقہ شخص کا مرض دوسرے مرحلے میں داخل ہو چکا ہے۔

جب قَسموں کو تکیہ کلام بنا لینے سے اس کی اصل حقیقت سب پر عیاں ہونے لگتی ہے اور اسے خود بھی احساس ہونے لگتا ہے کہ لوگوں نے اس پر اعتماد کرنا چھوڑ دیا ہے تو ردِّعمل کے طور پر اس کے دل میں ایمان اور اہلِ ایمان کے خلاف شدید نفرت اور دشمنی پیدا ہو جاتی ہے۔ اس دشمنی کا اصل ہدف اہلِ ایمان کے قائد کی شخصیت بنتی ہے‘ جیسے منافقینِ مدینہ محمدٌ رسول اللہ ﷺ کے بارے میں اکثر ہرزہ سرائی کرتے رہتے تھے کہ دیکھیں مدینہ میں سب لوگ آرام و سکون سے رہ رہے تھے۔ اس ایک شخص (ﷺ) کے آ جانے سے ہمارے لیے طرح طرح کے مسائل کھڑے ہو گئے ہیں‘ اس (ﷺ) نے بھائی کو بھائی سے جدا کر دیا ہے‘ خاندانوں میں کبھی نہ ختم ہونے والی رنجشیں پیدا کر دی ہیں۔ اسی (ﷺ) کی وجہ سے یہودی قبائل کے ساتھ ہمارے حلیفانہ تعلقات ختم ہو کر رہ گئے ہیں اور پورے عرب سے ہمیں لڑائیاں مول لینا پڑی ہیں۔ بہرحال جب یہ مرحلہ آ جائے تو سمجھ لیں کہ اب یہ مرض تیسری اور آخری سٹیج میں داخل ہو گیا ہے۔ کسی زمانے میں ٹی بی کے بارے میں یہی سمجھا جاتا تھا کہ تیسری سٹیج پر پہنچ کر یہ مرض لاعلاج ہو جاتا ہے۔

اس بارے میں ایک اہم بات یہ بھی جان لیجیے کہ منافقین صرف انقلابی تحریک کی صفوں میں

پیدا ہوتے ہیں۔ اس لیے آج ہمارے معاشرے کے جو لوگ دین کے تحریکی اور انقلابی تصوّر سے آشنا ہی نہیں وہ ضعیف الایمان تو ہو سکتے ہیں منافق نہیں۔ کیونکہ ان بے چاروں کو تو دین کا صحیح تصوّر دیا ہی نہیں گیا۔ انہیں تو مولویوں اور ان کے پیروں نے یہی بتایا ہے کہ دین بس نماز روزہ ہی کا نام ہے اور اگر رمضان میں لیلۃ القدر کی عبادت نصیب ہو گئی تو سمجھو زندگی بھر کے تمام گناہ دُھل گئے۔ اور جس نے حج یا عمرہ کر لیا وہ گناہوں سے بالکل ہی پاک ہو گیا' چاہے اس نے ساری عمر حرام خوریوں میں ہی کیوں نہ گزاری ہو۔ اب جس مسلمان کے ذہن میں دین کا یہ تصوّر ہو اس بے چارے کو منافقت سے کیا لینا دینا۔ منافقت تو وہاں جنم لیتی ہے جہاں قدم قدم پر تکلیفوں اور آزمائشوں کے پہاڑ عبور کرنے پڑتے ہیں۔ جہاں دین اپنے نام لیواؤں سے ان کے عیش و آرام اور جان و مال کی قربانیاں مانگتا ہے۔ چنانچہ اگر کوئی شخص دین کے تحریکی اور انقلابی فلسفے کو اچھی طرح سے سمجھ لے اور اقامتِ دین کی جِدّوجُہد کو فرضِ عین سمجھتے ہوئے کسی حقیقی انقلابی جماعت یا تحریک میں شمولیت اختیار کر لے اور پھر اس کے بعد امیر کے ڈانٹنے کی وجہ سے یا ایثار و قربانی کے تقاضوں سے گھبرا کر یا ایسی ہی کسی دوسری وجہ سے پیچھے ہٹ جائے تو وہ مرضِ نفاق کا شکار ہو جائے گا۔ البتہ اگر اس کے پیچھے ہٹنے کی وجہ کچھ اور ہو' مثلاً اس کو وہ تحریک اپنے مقصد سے ہٹتی ہوئی محسوس ہو یا تحریک کے طریق کار سے اسے اصولی اختلاف ہو جائے یا قائدین کے کردار میں اسے واضح خامیاں نظر آئیں تو یہ دوسری بات ہے۔ ایسی کسی صورت میں اگر وہ اس تحریک یا تنظیم کو چھوڑ دے گا تو وہ نفاق کا مرتکب نہیں ہو گا۔ لیکن ایسی صورت میں بھی وہ کسی مخصوص جماعت کو تو چھوڑ سکتا ہے' اقامتِ دین کی جِدّوجُہد کو ترک کر کے نہیں بیٹھ سکتا۔ اقامتِ دین کی ضرورت' اہمیت اور فرضیت کو ایک دفعہ سمجھ لینے کے بعد اب اس جِدّوجُہد کو جاری رکھنا اُس پر فرض ہے' چاہے یہ فرض وہ کسی دوسری جماعت میں شامل ہو کر ادا کرے یا اس مقصد کے لیے خود کوئی نئی جماعت تشکیل دے۔ اس حوالے سے ہمیں حضور ﷺ کے اس فرمان سے عبرت حاصل کرنی چاہیے۔ فجر اور عشاء کی نماز باجماعت میں شریک نہ ہونے والوں کے بارے میں آپ ﷺ نے فرمایا:

((اِنَّ اَثْقَلَ صَلَاۃٍ عَلَی الْمُنَافِقِیْنَ صَلَاۃُ الْعِشَاءِ وَصَلَاۃُ الْفَجْرِ' وَلَوْ یَعْلَمُوْنَ مَا فِیْھِمَا لَاَتَوْھُمَا وَلَوْ حَبْوًا ' وَلَقَدْ ھَمَمْتُ اَنْ آمُرَ بِالصَّلَاۃِ فَتُقَامَ ثُمَّ آمُرَ رَجُلًا فَیُصَلِّیَ بِالنَّاسِ ثُمَّ أَنْطَلِقَ مَعِی بِرِجَالٍ مَعَھُمْ حُزَمٌ مِنْ

حَطَبٍ اِلٰی قَوْمٍ لَا یَشْهَدُوْنَ الصَّلَاةَ فَاُحَرِّقَ عَلَیْهِمْ بُیُوْتَهُمْ بِالنَّارِ))[1]

''منافقوں پر سب سے بھاری نماز عشاء اور فجر کی نماز (باجماعت) ہے۔ اگر یہ ان دونوں نمازوں کی اہمیت کو جان جائیں تو ان میں شرکت کے لیے ضرور آئیں خواہ انہیں گھٹنوں کے بل آنا پڑے۔ اور مَیں نے تو پختہ ارادہ کر لیا تھا کہ نماز کھڑی کرنے کا حکم دوں' پھر کسی کو حکم دوں کہ وہ لوگوں کو نماز پڑھائے' پھر ایسے لوگوں کی طرف جاؤں جو نماز (باجماعت) میں شریک نہیں ہوتے اور میرے ہمراہ ایسے ساتھی ہوں جن کے پاس لکڑیوں کے گٹھے ہوں اور میں جماعت میں نہ پہنچنے والوں کے گھروں کو اُن کے سمیت آگ سے جلا دوں۔''

اگر جماعت سے نماز نہ پڑھنے والوں پر حضورﷺ کی ناراضی کا یہ عالم ہے تو جماعتی نظم کو ترک کر کے زندگی گزارنے کے انجام کا ہمیں خود اندازہ کر لینا چاہیے۔

آیات ۱ تا ۸

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ○

اِذَا جَآءَكَ الْمُنٰفِقُوْنَ قَالُوْا نَشْهَدُ اِنَّكَ لَرَسُوْلُ اللّٰهِ ۘ وَ اللّٰهُ
یَعْلَمُ اِنَّكَ لَرَسُوْلُهٗ ؕ وَ اللّٰهُ یَشْهَدُ اِنَّ الْمُنٰفِقِیْنَ لَكٰذِبُوْنَ ۚ﴿۱﴾
اِتَّخَذُوْۤا اَیْمَانَهُمْ جُنَّةً فَصَدُّوْا عَنْ سَبِیْلِ اللّٰهِ ؕ اِنَّهُمْ سَآءَ مَا
كَانُوْا یَعْمَلُوْنَ ﴿۲﴾ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ اٰمَنُوْا ثُمَّ كَفَرُوْا فَطُبِعَ عَلٰی
قُلُوْبِهِمْ فَهُمْ لَا یَفْقَهُوْنَ ﴿۳﴾ وَ اِذَا رَاَیْتَهُمْ تُعْجِبُكَ اَجْسَامُهُمْ ؕ وَ
اِنْ یَّقُوْلُوْا تَسْمَعْ لِقَوْلِهِمْ ؕ كَاَنَّهُمْ خُشُبٌ مُّسَنَّدَةٌ ؕ یَحْسَبُوْنَ
كُلَّ صَیْحَةٍ عَلَیْهِمْ ؕ هُمُ الْعَدُوُّ فَاحْذَرْهُمْ ؕ قٰتَلَهُمُ اللّٰهُ ۫ اَنّٰی
یُؤْفَكُوْنَ ﴿۴﴾ وَ اِذَا قِیْلَ لَهُمْ تَعَالَوْا یَسْتَغْفِرْ لَكُمْ رَسُوْلُ اللّٰهِ لَوَّوْا

۱۔ صحیح مسلم' کتاب المساجد و مواضع الصلاة' باب فضل صلاة الجماعة...' ح:۶۵۱۔ یہ حدیث صحیح بخاری اور دیگر کتبِ حدیث میں متعدد مقامات پر کم و بیش الفاظ کے ساتھ نقل ہوئی ہے۔

رُءُوْسَهُمْ وَ رَاَیْتَهُمْ یَصُدُّوْنَ وَهُمْ مُّسْتَكْبِرُوْنَ ۝ سَوَآءٌ عَلَیْهِمْ اَسْتَغْفَرْتَ لَهُمْ اَمْ لَمْ تَسْتَغْفِرْ لَهُمْ ؕ لَنْ یَّغْفِرَ اللّٰهُ لَهُمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَا یَهْدِی الْقَوْمَ الْفٰسِقِیْنَ ۝ هُمُ الَّذِیْنَ یَقُوْلُوْنَ لَا تُنْفِقُوْا عَلٰى مَنْ عِنْدَ رَسُوْلِ اللّٰهِ حَتّٰى یَنْفَضُّوْا ؕ وَ لِلّٰهِ خَزَآىِٕنُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ وَ لٰكِنَّ الْمُنٰفِقِیْنَ لَا یَفْقَهُوْنَ ۝ یَقُوْلُوْنَ لَىِٕنْ رَّجَعْنَاۤ اِلَى الْمَدِیْنَةِ لَیُخْرِجَنَّ الْاَعَزُّ مِنْهَا الْاَذَلَّ ؕ وَ لِلّٰهِ الْعِزَّةُ وَ لِرَسُوْلِهٖ وَ لِلْمُؤْمِنِیْنَ وَ لٰكِنَّ الْمُنٰفِقِیْنَ لَا یَعْلَمُوْنَ ۝

آیت 1 ﴿اِذَا جَآءَكَ الْمُنٰفِقُوْنَ قَالُوْا نَشْهَدُ اِنَّكَ لَرَسُوْلُ اللّٰهِ ۘ﴾ ’’(اے نبی ﷺ!) جب منافق آپ کے پاس آتے ہیں تو کہتے ہیں: ہم گواہی دیتے ہیں کہ بے شک آپ اللہ کے رسول ہیں۔‘‘

﴿وَاللّٰهُ یَعْلَمُ اِنَّكَ لَرَسُوْلُهٗ ؕ﴾ ’’اور اللہ جانتا ہے کہ یقیناً آپ اُس کے رسول ہیں۔‘‘

﴿وَاللّٰهُ یَشْهَدُ اِنَّ الْمُنٰفِقِیْنَ لَكٰذِبُوْنَ ۝﴾ ’’اور اللہ گواہی دیتا ہے کہ یہ منافقین یقیناً جھوٹے ہیں۔‘‘

یعنی آپؐ کی رسالت کی گواہی یہ لوگ صرف اپنی زبانوں سے دیتے ہیں‘ ان کے دل اس حقیقت کو تسلیم نہیں کرتے‘ اس لیے یہ لوگ جھوٹے (كٰذِبُوْن) ہیں۔ جیسا کہ تمہیدی کلمات میں ذکر ہوا ہے بات بات پر جھوٹ بولنا مرضِ منافقت کی پہلی سٹیج ہے۔

آیت 2 ﴿اِتَّخَذُوْۤا اَیْمَانَهُمْ جُنَّةً فَصَدُّوْا عَنْ سَبِیْلِ اللّٰهِ ؕ﴾ ’’انہوں نے اپنی قسموں کو ڈھال بنا رکھا ہے اور یہ اللہ کے راستے سے رُک گئے ہیں۔‘‘

جہاد و قتال سے بچنے کے لیے یہ لوگ قسمیں کھا کھا کر جھوٹے بہانے بناتے تھے کہ اللہ کی قسم میری بیوی سخت بیمار ہے‘ گھر میں کوئی دوسرا اس کی دیکھ بھال کرنے والا بھی نہیں‘ وغیرہ وغیرہ۔ جب نوبت قسموں تک پہنچ گئی تو گویا مرض دوسری سٹیج میں داخل ہو گیا۔

﴿اِنَّهُمْ سَآءَ مَا كَانُوْا یَعْمَلُوْنَ ۝﴾ ’’بہت ہی بُرا کام ہے جو یہ لوگ کر رہے ہیں۔‘‘

آیت ۳ ﴿ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ اٰمَنُوْا ثُمَّ كَفَرُوْا﴾ ’’یہ اس وجہ سے ہے کہ یہ لوگ ایمان لائے پھر کافر ہو گئے‘‘

یعنی ان کی منافقت شعوری نہیں ہے کہ وہ بدنیتی سے دھوکہ دینے کے لیے ایمان لائے ہوں۔ دینِ اسلام کی دعوت جب ان لوگوں تک پہنچی تھی تو ان کی فطرت نے گواہی دی تھی کہ یہ سچ اور حق کی دعوت ہے اور اُس وقت وہ نیک نیتی سے ایمان لائے تھے۔ کچھ دیر کے لیے انہیں ایمان کی دولت نصیب ہوئی تھی‘ لیکن ایمان لاتے وقت انہیں معلوم نہیں تھا کہ ع ’’یہ شہادت گہِ اُلفت میں قدم رکھنا ہے‘‘۔ اہلِ ایمان کے لیے اللہ تعالیٰ کا واضح حکم ہے: ﴿وَلَنَبْلُوَنَّكُمْ بِشَيْءٍ مِّنَ الْخَوْفِ وَالْجُوْعِ وَنَقْصٍ مِّنَ الْاَمْوَالِ وَالْاَنْفُسِ وَالثَّمَرٰتِ ۭ﴾ (البقرۃ:۱۵۵) کہ ہم تمہیں کسی قدر خوف‘ بھوک اور مال و جان کے نقصانات جیسی سخت آزمائشوں سے ضرور آزمائیں گے۔ لیکن منافقین کو اس صورتِ حال کا اندازہ نہیں تھا۔

منافقینِ مدینہ میں بہت سے ایسے لوگ بھی تھے جو اپنے قبیلے کے سردار کے پیچھے ایمان لے آئے تھے۔ جیسے اوس اور خزرج کے قائدین ایمان لے آئے تو پورا پورا قبیلہ مسلمان ہو گیا۔ انہیں کیا پتا تھا کہ عملی طور پر ایمان کے تقاضے کیا ہیں۔ وہ تو برف کے تودے کی اوپری سطح (tip of the iceberg) ہی کو دیکھ رہے تھے۔ وہ نہیں جانتے تھے کہ اس تودے کے نیچے کیا ہے۔ بہرحال ایسے لوگ ایمان تو سچے دل سے لائے تھے‘ لیکن ان کا ایمان تھا کمزور۔ اسی لیے تکلیفیں اور آزمائشیں دیکھ کر ان کے پاؤں لڑکھڑا گئے۔ البتہ ضعیف الایمان مسلمانوں میں بہت سے ایسے لوگ بھی تھے جو اپنی تمام تر کمزوریوں اور کوتاہیوں کے باوجود ایمان کے دامن سے وابستہ رہے۔ ان سے جب کوئی کوتاہی ہوئی تو انہوں نے اس کا اقرار بھی کیا اور اس کے لیے وہ معافی کے طلب گار بھی ہوئے۔ سورۃ التوبہ میں ان لوگوں کا ذکر گزر چکا ہے اور وہاں ان کے ضعفِ ایمان کا علاج بھی تجویز کر دیا گیا: ﴿خُذْ مِنْ اَمْوَالِهِمْ صَدَقَةً تُطَهِّرُهُمْ وَتُزَكِّيْهِمْ بِهَا وَصَلِّ عَلَيْهِمْ ۭ﴾ (التوبۃ:۱۰۳) ’’ان کے اموال میں سے صدقات قبول فرمائیے‘ اس (صدقے) کے ذریعے سے آپؐ انہیں پاک کریں گے اور ان کا تزکیہ کریں گے‘ اور ان کے لیے دعا کیجیے‘‘۔ یعنی انفاق فی سبیل اللہ سے ان کے ایمان کی کمزوری دور ہو جائے گی۔ بہرحال جو لوگ ایک دفعہ ایمان لانے کے بعد مشکلات سے گھبرا کر ایمان کے عملی تقاضوں سے جی چرانے لگے اور اپنی اس خیانت کو جھوٹے بہانوں سے چھپانے لگے وہ منافقت کی راہ پر چل نکلے۔

﴿فَطُبِعَ عَلٰی قُلُوْبِہِمْ فَہُمْ لَا یَفْقَہُوْنَ ۳﴾ ’’تو ان کے دلوں پر مہر لگا دی گئی‘ پس یہ سمجھنے سے عاری ہو گئے۔‘‘

ان کی منافقانہ روش کی وجہ سے اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان کے دلوں پر مہر لگا دی گئی۔ چنانچہ اب ان کی سمجھ بوجھ کی صلاحیت مفقود ہو چکی ہے اور یہ حقیقی تفقّہ سے عاری ہو چکے ہیں۔

آیت ۴ ﴿وَاِذَا رَاَیْتَہُمْ تُعْجِبُکَ اَجْسَامُہُمْ ؕ﴾ ’’(اے نبی ﷺ!) جب آپ انہیں دیکھتے ہیں تو ان کے جسم آپ کو بڑے اچھے لگتے ہیں۔‘‘

جسمانی طور پر ان کی شخصیات بڑی دلکش اور متاثر کن ہیں۔

﴿وَاِنْ یَّقُوْلُوْا تَسْمَعْ لِقَوْلِہِمْ ؕ﴾ ’’اور اگر وہ بات کرتے ہیں تو آپؐ ان کی بات سنتے ہیں۔‘‘

ظاہر ہے یہ لوگ سرمایہ دار بھی تھے اور معاشرتی لحاظ سے بھی صاحبِ حیثیت تھے۔ اس لحاظ سے ان کی گفتگو ہر فورم پر توجّہ سے سنی جاتی تھی۔

﴿کَاَنَّہُمْ خُشُبٌ مُّسَنَّدَۃٌ ؕ﴾ ’’(لیکن اصل میں) یہ دیوار سے لگائی ہوئی خشک لکڑیوں کی مانند ہیں۔‘‘

حقیقت میں ان لوگوں کی حیثیت ان خشک لکڑیوں کی سی ہے جو کسی سہارے کے بغیر کھڑی بھی نہیں ہو سکتیں اور انہیں دیوار کی ٹیک لگا کر کھڑا کیا جاتا ہے۔

﴿یَحْسَبُوْنَ کُلَّ صَیْحَۃٍ عَلَیْہِمْ ؕ﴾ ’’یہ ہر زور کی آواز کو اپنے ہی اوپر گمان کرتے ہیں۔‘‘

اندر سے یہ لوگ اس قدر بودے اور بزدل ہیں کہ کوئی بھی زور کی آواز یا کوئی آہٹ سنتے ہیں تو ان کی جان پر بن جاتی ہے۔ یہ ہر خطرے کو اپنے ہی اوپر سمجھتے ہیں اور ہر وقت کسی ناگہانی حملے کے خدشے یا جہاد وقتال کے تقاضے کے ڈر سے سہمے رہتے ہیں۔

﴿ہُمُ الْعَدُوُّ فَاحْذَرْہُمْ ؕ﴾ ’’(آپؐ کے) اصل دشمن یہی ہیں‘ آپ ان سے بچ کر رہیں!‘‘

یہ ان کے مرضِ نفاق کی تیسری سٹیج کا ذکر ہے۔ ان کی دشمنی چونکہ دوستی کے پردے میں چھپی ہوتی ہے اس لیے یہاں خصوصی طور پر ان سے ہوشیار رہنے کی ہدایت کی جا رہی ہے کہ اے

نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم! یہ لوگ آستین کے سانپ ہیں۔ مشرکینِ مکّہ کے لشکر آپ لوگوں کے لیے اتنے خطرناک نہیں جتنے یہ اندر کے دشمن خطرناک ہیں۔ لہٰذا آپؐ ان کو ہلکا نہ سمجھیں اور ان سے ہوشیار رہیں۔ ایسی صورت حال کے لیے حضرت مسیح علیہ السلام کا یہ قول بہت اہم ہے کہ ''فاختہ کی مانند بے ضرر لیکن سانپ کی طرح ہوشیار رہو''۔ منافقین اگرچہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے دشمنی کا کوئی موقع ہاتھ سے نہیں جانے دیتے تھے' لیکن حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی شان یہی تھی کہ آپؐ ان کی غلطیاں اور گستاخیاں مسلسل نظرانداز فرماتے رہتے تھے' بلکہ آپؐ اپنی طبعی شرافت اور مروّت کی وجہ سے ان کے جھوٹے بہانے بھی مان لیتے تھے۔ یہاں تک کہ غزوۂ تبوک کی تیاری کے موقع پر جب آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بہت سے منافقین کو جھوٹے بہانوں کی وجہ سے پیچھے رہ جانے کی اجازت دے دی تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے تنبیہہ آگئی: ﴿عَفَا اللّٰهُ عَنْكَ ۚ لِمَ اَذِنْتَ لَهُمْ حَتّٰى يَتَبَيَّنَ لَكَ الَّذِيْنَ صَدَقُوْا وَتَعْلَمَ الْكٰذِبِيْنَ ﴿۴۳﴾﴾ (التوبۃ) ''(اے نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم!) اللہ آپ کو معاف فرمائے (یا اللہ نے آپ کو معاف فرمادیا) آپ نے انہیں کیوں اجازت دے دی؟ یہاں تک کہ آپ کے لیے واضح ہوجاتا کہ کون لوگ سچّے ہیں اور آپ (یہ بھی) جان لیتے کہ کون جھوٹے ہیں!''

﴿قٰتَلَهُمُ اللّٰهُ ۚ اَنّٰى يُؤْفَكُوْنَ ﴿۴﴾﴾ ''اللہ ان کو ہلاک کرے' یہ کہاں سے پھرائے جارہے ہیں!''

تصوّر کیجیے یہ لوگ کس قدر قابلِ رشک مقام سے ناکام و نامراد لوٹے ہیں! ان کو نبی آخر الزماں صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا زمانہ نصیب ہوا' آپؐ کی دعوتِ ایمان پر لبیک کہنے کی توفیق ملی' آپؐ کے قدموں میں بیٹھنے کے مواقع ہاتھ آئے۔ کیسی کیسی سعادتیں تھیں جوان لوگوں کے حصّے میں آئی تھیں۔ بقول ابراہیم ذوق: ع ''یہ نصیب اللہ اکبر! لوٹنے کی جائے ہے''۔ مگر دوسری طرف ان کی بدنصیبی کی انتہا یہ ہے کہ یہاں تک پہنچ کر بھی یہ لوگ نامراد کے نامراد ہی رہے۔ مقامِ عبرت ہے! کس بلندی پر پہنچ کر یہ لوگ کس اتھاہ پستی میں گرے ہیں: ؎

قسمت کی خوبی دیکھیے ٹوٹی کہاں کمند ۔۔۔ دو چار ہاتھ جب کہ لبِ بام رہ گیا!

آیت ۵ ﴿وَاِذَا قِيْلَ لَهُمْ تَعَالَوْا يَسْتَغْفِرْ لَكُمْ رَسُوْلُ اللّٰهِ﴾ ''اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ آؤ (اپنی غلطی مان لو) تاکہ اللہ کے رسولؐ تمہارے لیے استغفار کریں''

ظاہر ہے ان کے دلوں میں تو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے خلاف بغض اور عناد پیدا ہو چکا تھا تو ان حالات میں وہ کیسے آتے اور کیونکر اپنی غلطی تسلیم کرتے؟

﴿لَوَّوۡا رُءُوۡسَهُمۡ﴾ ''تو وہ اپنے سروں کو مٹکاتے ہیں''

کہ ہاں ہاں! ٹھیک ہے ہم آئیں گے‘ ضرور آئیں گے۔

﴿وَرَاَيۡتَهُمۡ يَصُدُّوۡنَ وَهُمۡ مُّسۡتَكۡبِرُوۡنَ ۝۵﴾ ''اور آپ انہیں دیکھتے ہیں کہ وہ رک جاتے ہیں تکبّر کرتے ہوئے۔''

ان کے دلوں میں چونکہ تکبّر ہے‘ اس لیے وہ آپؐ کے پاس آ کر معافی مانگنے کو اپنی ہتک سمجھتے ہیں کہ دیکھیں جی آخر ہماری بھی کوئی عزّت ہے‘ اب کون روز روز وہاں جا کر مجرموں کی طرح اقبالِ جرم کرے اور ڈانٹ سنے!

آیت ۶ ﴿سَوَآءٌ عَلَيۡهِمۡ اَسۡتَغۡفَرۡتَ لَهُمۡ اَمۡ لَمۡ تَسۡتَغۡفِرۡ لَهُمۡ ؕ﴾ ''(اے نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم!) ان کے لیے برابر ہے کہ آپ ان کے لیے استغفار کریں یا ان کے لیے استغفار نہ کریں۔''

﴿لَنۡ يَّغۡفِرَ اللّٰهُ لَهُمۡ ؕ﴾ ''اللہ ان کو ہرگز معاف نہیں کرے گا۔''

یہی مضمون اس سے زیادہ سخت الفاظ میں سورۃ التوبہ میں بھی آ چکا ہے۔ وہاں ان لوگوں کے بارے میں فرمایا گیا: ﴿اِسۡتَغۡفِرۡ لَهُمۡ اَوۡلَا تَسۡتَغۡفِرۡ لَهُمۡ ؕ اِنۡ تَسۡتَغۡفِرۡ لَهُمۡ سَبۡعِيۡنَ مَرَّةً فَلَنۡ يَّغۡفِرَ اللّٰهُ لَهُمۡ ؕ﴾ (آیت ۸۰) ''(اے نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم!) آپ خواہ ان کے لیے استغفار کریں یا ان کے لیے استغفار نہ کریں۔ اگر آپ ستّر مرتبہ بھی ان کے لیے استغفار کریں گے تب بھی اللہ انہیں ہرگز معاف نہیں فرمائے گا''۔ لیکن حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نرم دلی اور مروّت کی اپنی شان ہے۔ آپؐ نے اس آیت کے نزول کے بعد ایک موقع پر مسکراتے ہوئے ارشاد فرمایا تھا: ((لَوْ اَعْلَمُ اَنِّی اِنْ زِدْتُ عَلَى السَّبْعِيْنَ غُفِرَ لَهٗ لَزِدْتُ عَلَيْهَا))(۲) ''اگر مجھے معلوم ہوتا کہ ستّر سے زیادہ مرتبہ استغفار کرنے سے اس کی معافی ہو سکتی ہے تو مَیں اس پر اضافہ کر لیتا''۔ واضح رہے کہ یہاں ستّر کا عدد محاورے کے طور پر آیا ہے۔ مراد اس سے یہ ہے کہ اب ان کے لیے آپؐ کا استغفار کرنا انہیں کچھ بھی فائدہ نہیں دے سکتا۔ ان کے دلوں میں آپؐ کی

۲۔ احکام الجنائز للالبانی‘ ح: ۱۲۱‘ راوی: عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ۔

عداوت اب اس نہج پر پہنچ چکی ہے کہ ان کی بخشش ممکن ہی نہیں۔

اب آئندہ آیات میں ایک واقعہ کے حوالے سے اہلِ ایمان کے ساتھ منافقین کی عداوت کا نقشہ دکھایا جا رہا ہے۔ یہ واقعہ غزوۂ بنی مصطلق سے واپسی کے سفر میں پیش آیا تھا۔ مریسیع کے کنوئیں کے قریب جہاں لشکر کا پڑاؤ تھا' دو مسلمانوں کا پانی بھرنے پر آپس میں جھگڑا ہو گیا۔ ان میں سے ایک انصار کا حلیف تھا جبکہ دوسرا حضرت عمرؓ کا خادم تھا' جس نے جذبات میں آ کر اس کو ایک لات رسید کر دی۔ اس پر منافقین نے اس کو بڑھا چڑھا کر مہاجرین اور انصار کے مابین جھگڑے کا رنگ دے دیا۔ عبداللہ بن اُبی نے' جو اس طرح کے مواقع کی ہمیشہ گھات میں رہتا' موقع سے فائدہ اٹھا کر مہاجرین کے خلاف انصار کے جذبات بھڑکانے کے لیے نہایت زہر آلود فقرے کہے۔ اس نے انصار کو مخاطب کر کے کہا: اے مدینہ والو! یہ ہمارے گھر میں پناہ پا کر اب ہمیں پر غرانے لگے ہیں۔ سچ کہا ہے جس نے کہا ہے کہ سَمِّنْ کَلْبَکَ یَاْکُلْکَ کہ تم اپنے کُتّے کو کھلا پلا کر خوب موٹا کرو تا کہ وہ تم ہی کو کاٹے۔ تم نے ان بے گھر لوگوں کو سر چھپانے کی جگہ دی' ان کی مدد کی' انہیں کھلایا پلایا اور اپنے مال میں ان کو حصّہ دار بنایا۔ یہ تمہاری اپنی غلطی کا خمیازہ ہے جو تمہیں بھگتنا پڑ رہا ہے۔ اگر تم ان کی امداد سے ہاتھ کھینچ لیتے تو یہ کب کے یہاں سے بھاگ کھڑے ہوتے —— خدا کی قسم! اب ہم پلٹے تو جو باعزّت ہیں وہ رذیلوں کو مدینہ سے نکال باہر کریں گے۔ عبداللہ بن اُبی کی یہ بکواس وہاں موقع پر موجود ایک نوجوان صحابی حضرت زید بن ارقمؓ سن رہے تھے۔ انہوں نے حضورﷺ کی خدمت میں پیش ہو کر سارا واقعہ بیان کر دیا۔ حضورﷺ نے عبداللہ بن اُبی کو بلا کر دریافت فرمایا تو وہ صاف مکر گیا' بلکہ اس نے الٹا احتجاج کیا کہ کیا آپؐ میرے معاملے میں اس چھوکرے (حضرت زید بن ارقمؓ) کی بات پر یقین کریں گے؟ اس طرح حضرت زیدؓ کی پوزیشن بڑی خراب ہو گئی۔ ان آیات کے نزول کے بعد جب واقعہ کی تصدیق ہو گئی تو حضورﷺ نے حضرت زید بن ارقمؓ کی خصوصی طور پر دلجوئی فرمائی اور شفقت سے ان کا کان مروڑتے ہوئے فرمایا کہ لڑکے کے کان نے غلط نہیں سنا تھا۔

اس واقعہ کے حوالے سے یہ نکتہ بہت اہم ہے کہ عبداللہ بن اُبی کا جرم ثابت ہو جانے کے بعد بھی حضورﷺ نے اس کے خلاف کوئی اقدام نہیں کیا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ اس وقت تک عملاً اسلامی ریاست قائم نہیں ہوئی تھی۔ اس بارے میں عام طور پر تو یہی سمجھا جاتا ہے کہ حضورﷺ کے مدینہ تشریف لے جانے کے فوراً بعد ہی وہاں باقاعدہ اسلامی ریاست وجود میں

آ گئی تھی اور حضور ﷺ کو باقاعدہ ایک سربراہِ ریاست اور سربراہِ حکومت کی حیثیت حاصل ہو گئی تھی‘لیکن اُس دور کے معروضی حقائق اور واقعات سے ثابت ہوتا ہے کہ یہ خیال درست نہیں ہے۔ مثلاً ہم دیکھتے ہیں کہ غزوۂ اُحد کے موقع پر اسلامی لشکر کو چھوڑ کر جانے والے تین سو افراد سے کسی قسم کا کوئی تعرض نہیں کیا گیا۔ اسی طرح یہ بھی حقیقت ہے کہ منافقینِ مدینہ اپنے فیصلے حضور ﷺ کے بجائے یہودیوں سے کرواتے تھے۔ ظاہر ہے کسی ریاست میں تو ایسا نہیں ہوتا کہ اس کی ایک تہائی فوج دشمن کے مقابلے سے بھاگ جائے اور ان میں سے کسی ایک فرد سے بھی اس بارے میں کوئی باز پُرس نہ ہو‘اور نہ ہی کسی ریاست کی عملداری میں یہ ممکن ہے کہ اس کا کوئی شہری ریاست کی عدالت کو چھوڑ کر اپنا مقدمہ کہیں اور لے جائے۔ بہرحال اس حوالے سے اصل صورتِ حال یہ تھی کہ علاقے کی واحد منظّم اور طاقتور جماعت کے سربراہ کی حیثیت سے حضور ﷺ کو مدینہ میں معاشرتی وسیاسی لحاظ سے ایک خصوصی اور ممتاز مقام تو ہجرت کے فوراً بعد ہی حاصل ہو گیا تھا۔ البتہ آپؐ کے تحت ایک باقاعدہ ریاست فتح مکّہ کے بعد قائم ہوئی۔ یہی وجہ ہے کہ ۹ ہجری میں غزوۂ تبوک سے رہ جانے والے لوگوں کا سخت مؤاخذہ ہوا۔

بہرحال عبداللہ بن اُبی کے معاملے میں حضور ﷺ نے بہت درگزر سے کام لیا۔ واقعۂ اِفک میں اس کے کردار سے حضور ﷺ بہت آزردہ ہوئے تھے۔ اس دوران تو ایک موقع پر آپ ﷺ نے یہاں تک فرما دیا تھا کہ کیا کوئی ایسا شخص نہیں ہے جو اس شخص کی ایذا سے مجھے بچا سکے؟ لیکن آپؐ کا یہ فرمان بھی محض آپؐ کے جذبات کا اظہار تھا‘ جبکہ آپؐ نے اس کے خلاف کسی عملی اقدام کا حکم اس وقت بھی نہیں دیا۔ البتہ اس موقع پر اوس کے سردار حضرت سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ نے رسول اللہ ﷺ سے عرض کیا: حضور! آپؐ مجھے حکم دیں‘ میں اس شخص کا کام تمام کرتا ہوں۔ اس پر خزرج کے سردار حضرت سعد بن عبادہ رضی اللہ عنہ نے حضرت سعدؓ بن معاذ کو مخاطب کرتے ہوئے کہا کہ آپ نے عبداللہ بن اُبی کے قتل کی بات اس لیے کی ہے کہ اس کا تعلق قبیلہ خزرج سے ہے! اور پھر حضرت سعد بن عبادہؓ ہی نے حضور ﷺ کو مشورہ دیا تھا کہ حضور! آپ اس شخص کے معاملے میں نرمی سے کام لیں۔ اس کا اصل مسئلہ یہ ہے کہ ہم اسے اپنا بادشاہ بنانے کا فیصلہ کر چکے تھے اور اس کے لیے ہم نے سونے کا تاج بھی تیار کر لیا تھا کہ اسی اثنا میں آپؐ مدینہ تشریف لے آئے۔ اس طرح اس کے سارے خواب بکھر گئے۔ ہمارے قبیلے پر ابھی تک اس کا اثر ورسوخ موجود ہے‘ اس لیے حکمت اور مصلحت کا تقاضا یہی ہے کہ اس کے خلاف سختی نہ کی

جائے۔ بہرحال اس ساری تفصیل کا خلاصہ یہ ہے کہ اُس وقت تک باقاعدہ اسلامی ریاست اور حکومت بھی وجود میں نہیں آئی تھی اور ابھی قبائلی عصبیتیں بھی کسی نہ کسی حد تک موجود تھیں۔ یعنی مجموعی طور پر حالات ایسے نہیں تھے کہ حضور ﷺ ان پہلوؤں کو نظرانداز کر کے عبداللہ بن اُبی کے خلاف کوئی سخت اقدام کرنے کا حکم دیتے۔ اس لیے آپؐ نے اس کا یہ جرم بھی نظرانداز کر دیا۔

﴿اِنَّ اللّٰهَ لَا يَهۡدِى الۡقَوۡمَ الۡفٰسِقِيۡنَ ۝۶﴾ ''یقیناً اللہ ایسے فاسقوں کو ہدایت نہیں دیتا۔''

آیت ۷ ﴿هُمُ الَّذِيۡنَ يَقُوۡلُوۡنَ لَا تُنۡفِقُوۡا عَلٰى مَنۡ عِنۡدَ رَسُوۡلِ اللّٰهِ حَتّٰى يَنۡفَضُّوۡا ؕ﴾ ''یہی ہیں وہ لوگ جو کہتے ہیں کہ مت خرچ کرو ان پر جو اللہ کے رسول (ﷺ) کے گرد جمع ہو گئے ہیں، یہاں تک کہ یہ منتشر ہو جائیں۔''

منافقین سمجھتے تھے کہ اگر اہلِ مدینہ مہاجر مسلمانوں پر خرچ کرنا بند کر دیں گے تو چند ہی دنوں میں یہ ساری بھیڑ چھٹ جائے گی۔ یہی بات عبداللہ بن اُبی نے متذکرہ بالا جھگڑے کے موقع پر انصارِ مدینہ سے کہی تھی۔

﴿وَلِلّٰهِ خَزَآئِنُ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ وَلٰكِنَّ الۡمُنٰفِقِيۡنَ لَا يَفۡقَهُوۡنَ ۝۷﴾

''حالانکہ آسمانوں اور زمین کے خزانے تو اللہ ہی کے ہیں، لیکن منافقین اس حقیقت کا فہم نہیں رکھتے۔''

یہاں آسمانوں اور زمین سے مراد پوری کائنات ہے۔

آیت ۸ ﴿يَقُوۡلُوۡنَ لَئِنۡ رَّجَعۡنَاۤ اِلَى الۡمَدِيۡنَةِ لَيُخۡرِجَنَّ الۡاَعَزُّ مِنۡهَا الۡاَذَلَّ ؕ﴾ ''وہ کہتے ہیں کہ اگر ہم مدینہ لوٹ گئے تو جو طاقتور ہیں وہ لازماً نکال باہر کریں گے وہاں سے ان کمزور لوگوں کو۔''

عربی میں عزّت کا اصل مفہوم طاقت اور غلبہ ہے، جبکہ ذلیل کے معنی کمزور اور بے حیثیت کے ہیں۔ مذکورہ واقعہ چونکہ غزوۂ بنی مصطلق سے واپس آتے ہوئے راستے میں پیش آیا تھا اس لیے منافقین کے مکالمے میں یہاں مدینہ پلٹنے کا ذکر آیا ہے۔ عبداللہ بن اُبی نے لوگوں کے جذبات بھڑکاتے ہوئے یہ بھی کہا تھا کہ جب ہم مدینہ واپس پہنچیں تو بالکل متفق الرائے ہو کر یہ طے کر لیں کہ جو صاحبِ عزّت ہیں، جو مدینہ کے قدیم باشندے (sons of the soil) ہیں

وہ ان مہاجروں کو جو بڑے کمزور ہیں، جن کی کوئی حیثیت نہیں، مدینہ سے نکال باہر کریں گے۔

﴿وَلِلّٰهِ الْعِزَّةُ وَلِرَسُوْلِهٖ وَلِلْمُؤْمِنِيْنَ وَلٰكِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ ۝۸﴾

''حالانکہ اصل عزّت تو اللہ' اُس کے رسولؐ اور مؤمنین کے لیے ہے' لیکن یہ منافق جانتے نہیں۔''

عبداللہ بن اُبی کے بیٹے کا نام بھی عبداللہ ؓ تھا' جو بہت مخلص' صادق القول اور صادق الایمان صحابی تھے۔ انہیں جب معلوم ہوا کہ میرے باپ نے یہ بکواس کی ہے تو انہوں نے اپنے باپ کو سبق سکھانے کی ٹھان لی۔ چنانچہ لشکر جب واپس مدینہ پہنچا تو حضرت عبداللہ ؓ تلوار سونت کر اپنے باپ کے راستے میں کھڑے ہو گئے۔ انہوںؓ نے عبداللہ بن اُبی سے کہا اب جب تک تم یہ نہیں کہو گے کہ میں ذلیل ہوں اور تمام عزّت اللہ' اُس کے رسولؐ اور اہلِ ایمان کے لیے ہے' اُس وقت تک مَیں تمہیں شہر میں داخل نہیں ہونے دوں گا۔ عبداللہ بن اُبی نے اُس پر حضور ﷺ سے بھی فریاد کی' لوگوں کے سامنے بھی دہائی دی کہ دیکھو میرا اپنا بیٹا میرے قتل کے درپے ہے۔ لیکن حضرت عبداللہؓ اپنے موقف پر قائم رہے اور انہوں نے اپنی مذکورہ شرط منوا کر ہی اپنے باپ کو شہر میں داخل ہونے کی اجازت دی۔

یہ آٹھ آیات تو نفاق کے مراحل اور اس کی تشخیص اور پیش بینی (prognosis) کے بارے میں تھیں۔ ان میں گویا مرضِ نفاق' اس کی علامات' اس کا نقطۂ آغاز' اس کا سبب' اس کے مختلف مراتب و مدارج اور اس کی ہلاکت خیزی' یہ تمام چیزیں زیر بحث آگئیں۔ ان آیات کا خلاصہ یہی ہے کہ نفاق کی وجہ سے بالآخر انسان کے دل میں اللہ کے رسول ﷺ اور اہلِ ایمان کے خلاف شدید دشمنی پیدا ہو جاتی ہے اور یہ بیماری انسان کو ہلاکت و بربادی کے راستے پر وہاں تک پہنچا دیتی ہے جہاں اللہ کے رسولؐ کا استغفار بھی اس کے کام نہیں آ سکتا۔

آیات ۹ تا ۱۱

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تُلْهِكُمْ اَمْوَالُكُمْ وَلَاۤ اَوْلَادُكُمْ عَنْ ذِكْرِ اللّٰهِ ۚ وَمَنْ يَّفْعَلْ ذٰلِكَ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْخٰسِرُوْنَ ۝۹ وَاَنْفِقُوْا مِنْ مَّا رَزَقْنٰكُمْ مِّنْ قَبْلِ اَنْ يَّاْتِيَ اَحَدَكُمُ الْمَوْتُ

فَيَقُوْلَ رَبِّ لَوْ لَآ اَخَّرْتَنِيْٓ اِلٰٓى اَجَلٍ قَرِيْبٍ ۙ فَاَصَّدَّقَ وَ اَكُنْ مِّنَ الصّٰلِحِيْنَ ۝۱۰ وَلَنْ يُّؤَخِّرَ اللّٰهُ نَفْسًا اِذَا جَآءَ اَجَلُهَا ۭ وَاللّٰهُ خَبِيْرٌۢ بِمَا تَعْمَلُوْنَ ۝۱۱

اب دوسرے رکوع کی تین آیات میں اس بیماری کا علاج بتایا گیا ہے۔ جس طرح طب میں ایک مرض کا علاج دو طرح سے کیا جاتا ہے‘ ایک حفاظتی (preventive) قسم کا علاج ہے اور دوسرا معالجاتی (curative) طرز کا‘ اسی طرح یہاں بھی مرضِ نفاق کے علاج کے ضمن میں یہ دونوں پہلو سامنے آ رہے ہیں۔ ظاہر ہے کسی بیماری کے حوالے سے انسان کی پہلی کوشش تو یہی ہونی چاہیے کہ وہ اس بیماری کی چھوت سے بچا رہے۔ اس کے لیے ظاہر ہے اسے پرہیزی اقدام (preventive measures) اپنانے کی ضرورت ہوگی۔ جیسے آج کل کسی بیماری سے بچنے کا مؤثر طریقہ یہی ہے کہ آپ متعلقہ ویکسی نیشن کا انجکشن لگوالیں۔ چنانچہ اب اگلی آیت میں اس اقدام کا ذکر ہے جسے نفاق کی بیماری سے بچنے کے لیے حفظِ ماتقدم کے طور پر اپنانا ضروری ہے۔

آیت ۹ ﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تُلْهِكُمْ اَمْوَالُكُمْ وَلَآ اَوْلَادُكُمْ عَنْ ذِكْرِ اللّٰهِ ۚ﴾ ’’اے اہلِ ایمان! تمہیں غافل نہ کرنے پائیں تمہارے اموال اور تمہاری اولاد اللہ کی یاد سے۔‘‘

یہاں دو چیزوں کو معیّن کیا گیا ہے جو انسان کو اللہ کی یاد سے غافل کرنے کا باعث بنتی ہیں‘ یعنی مال اور اولاد۔ یہی مضمون آگے چل کر سورۃ التغابن میں نہایت واضح شکل میں بایں الفاظ آیا ہے: ﴿اِنَّمَآ اَمْوَالُكُمْ وَاَوْلَادُكُمْ فِتْنَةٌ ۭ﴾ (آیت ۱۵) ’’جان لو تمہارے مال اور تمہاری اولاد ہی ذریعۂ آزمائش ہیں‘‘۔ یہی تو وہ کسوٹی ہے جس پر تمہیں پرکھا جا رہا ہے۔ چنانچہ متنبہ کر دیا گیا کہ اہلِ ایمان! دیکھنا تمہیں تمہارے اموال اور تمہاری اولاد اللہ کی یاد سے غافل نہ کر دیں۔

﴿وَمَنْ يَّفْعَلْ ذٰلِكَ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْخٰسِرُوْنَ ۝۹﴾ ’’اور جو کوئی ایسا کریں گے تو وہی خسارے میں رہیں گے۔‘‘

یہاں اللہ کے ذکر سے مراد صرف یہی نہیں کہ انسان ہر وقت تسبیحات وغیرہ پڑھتا رہے‘ بلکہ اس کا وسیع تر مفہوم یہ ہے کہ انسان کو ہر وقت اللہ یاد رہے اور اسی بنا پر وہ اپنے جملہ فرائض کی

ادائیگی کے لیے ہر وقت کمر بستہ رہے۔ تو اے اہلِ ایمان! کہیں ایسا نہ ہو کہ اموال و اولاد کے معاملات میں منہمک ہو کر تم لوگ اللہ ہی کو بھلا دو۔ جیسا کہ آج کل ہماری اکثریت کا حال ہے۔ آج اگر آپ لوگوں کو اللہ اور دین کی طرف بلائیں تو آپ کو عام طور پر یہی جواب ملے گا کہ کیا کریں جی وقت ہی نہیں ملتا! اب ظاہر ہے جو شخص ایک خاص ''معیارِ زندگی'' کو اپنا معبود بنا کر دن رات اس کی پوجا میں لگا ہو تو اُس کے پاس معبودِ حقیقی کی طرف رجوع کرنے کے لیے وقت کیونکر بچے گا؟ چنانچہ مرضِ نفاق کی چھوت سے بچنے کے لیے پرہیزی اقدام یہ بتایا گیا کہ اللہ کی یاد کسی وقت بھی تمہیں بھولنے نہ پائے۔ اور ساتھ ہی اللہ کی یاد کو بھلانے والے دو اہم ترین عوامل کی نشاندہی بھی کر دی گئی۔ ظاہر ہے کسی بھی بیماری کا علاج کرنے کے لیے اس کے اصل اور بنیادی سبب کے بارے میں جاننا ضروری ہے۔ جب بیماری کا سبب ڈھونڈ کر اس کی بیخ کنی کر دی جائے گی تو وہ بیماری دور ہو جائے گی۔ نفاق کی بیماری کا اصل سبب چونکہ دنیا کی محبّت ہے اور دنیا کی محبت کا سب سے بڑا مظہر مال کی محبّت ہے' لہٰذا اس بیماری سے نجات حاصل کرنے کے لیے ضروری ہے کہ دل سے مال کی محبّت ختم کر دی جائے اور اس محبّت کو ختم کرنے کا مؤثر طریقہ یہاں یہ بتایا جا رہا ہے کہ زیادہ سے زیادہ مال اللہ کی راہ میں خرچ کیا جائے:

آیت ۱۰ ﴿وَاَنۡفِقُوۡا مِنۡ مَّا رَزَقۡنٰکُمۡ مِّنۡ قَبۡلِ اَنۡ یَّاۡتِیَ اَحَدَکُمُ الۡمَوۡتُ﴾

''اور خرچ کرو اس میں سے جو کچھ ہم نے تمہیں دیا ہے اس سے پہلے پہلے کہ تم میں سے کسی کی موت کا وقت آ جائے''

﴿فَیَقُوۡلَ رَبِّ لَوۡ لَاۤ اَخَّرۡتَنِیۡۤ اِلٰۤی اَجَلٍ قَرِیۡبٍ ۙ فَاَصَّدَّقَ وَ اَکُنۡ مِّنَ الصّٰلِحِیۡنَ ﴿۱۰﴾﴾ ''پھر وہ اُس وقت کہے کہ اے میرے رب! تُو نے مجھے ایک قریب وقت تک کیوں مہلت نہ دی کہ مَیں صدقہ کرتا اور نیک لوگوں میں سے ہو جاتا!''

گویا نفاق کی بیماری کا بالمثل علاج انفاق ہے۔ سورۃ الحدید کی آیت ۱۸ کے تحت وضاحت کی جا چکی ہے کہ مال کی محبّت کو دل سے نکالنے کے لیے دل کی زمین میں ''انفاق'' کا ہل چلانا پڑتا ہے اور جو لوگ یہ ہل چلانے میں کامیاب ہو جاتے ہیں اصل کامیابی انہی کے حصے میں آتی ہے:

﴿اِنَّ الۡمُصَّدِّقِیۡنَ وَ الۡمُصَّدِّقٰتِ وَ اَقۡرَضُوا اللّٰہَ قَرۡضًا حَسَنًا یُّضٰعَفُ لَہُمۡ وَ لَہُمۡ اَجۡرٌ کَرِیۡمٌ ﴿۱۸﴾ وَ الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا بِاللّٰہِ وَ رُسُلِہٖۤ اُولٰٓئِکَ ہُمُ

الصِّدِّيْقُوْنَ ﳓ وَالشُّهَدَآءُ عِنْدَ رَبِّهِمْ ......﴾

''یقیناً صدقہ دینے والے مرد اور صدقہ دینے والی عورتیں اور جو اللہ کو قرضِ حسنہ دیں' ان کو کئی گنا بڑھا کر دیا جائے گا اور ان کے لیے بڑا باعزّت اجر ہو گا۔ اور جو لوگ ایمان لائے اللہ پر اور اُس کے رسولوں پر انہی میں سے صِدّیق اور شہداء ہوں گے اپنے رب کے پاس......''

زیر مطالعہ آیت میں نقشہ کھینچا گیا ہے کہ ایک بڑا حسرت کا وقت آئے گا جب انسان کفِ افسوس ملے گا کہ اے کاش! مَیں اس مال کو اللہ کی راہ میں صدقہ کر سکتا۔ آج یہ لوگ دونوں ہاتھوں سے مال جمع کر رہے ہیں اور گھروں کی آرائش و زیبائش پر بے تحاشا خرچ کر رہے ہیں' لیکن ایک وقت آئے گا جب اہل و عیال' عزیز و اقارب' مال و دولت اور جائیداد' سب کو چھوڑ کر یہاں سے جانا ہو گا۔ اُس وقت انسان حسرت سے کہے گا کہ پروردگار! کیوں نہ تُو نے مجھے ذرا اور مہلت دے دی! تُو اگر ذرا اس وقت کو ٹال دے تو پھر مَیں یہ سب کچھ تیری راہ میں لٹا دوں' سارا مال صدقہ کر دوں اور میں بالکل سچائی اور نیکوکاری کی راہ اختیار کر لوں۔ لیکن اُس وقت اس حسرت کا کوئی نتیجہ برآمد نہیں ہو گا۔ اس لیے کہ اللہ کی یہ سُنّتِ ثابتہ ہے کہ جب کسی کا وقتِ معیّن آ جائے تو پھر اسے مؤخر نہیں کیا جاتا!

آیت ۱۱ ﴿وَلَنْ يُّؤَخِّرَ اللّٰهُ نَفْسًا اِذَا جَآءَ اَجَلُهَا ؕ﴾ ''اور اللہ ہرگز مہلت نہیں دے گا کسی جان کو جب اُس کا وقتِ معیّن آ پہنچے گا۔''

قوموں کی ''اجل'' مؤخر ہونے کی ایک مثال تو موجود ہے' حضرت یونس علیہ السلام کی قوم کے معاملے میں عین وقت پر عذاب ٹالنے کا فیصلہ ہوا تھا' لیکن انسانوں کی انفرادی اجل کبھی مؤخر نہیں کی گئی۔

﴿وَاللّٰهُ خَبِيْرٌۢ بِمَا تَعْمَلُوْنَ ﴿١١﴾﴾ ''اور جو کچھ تم کر رہے ہو اللہ اُس سے باخبر ہے۔''

اللہ تعالیٰ کو معلوم ہے کہ اس وقت کی یہ جزع فزع اور نالہ و شیون بھی فی الحقیقت منافقانہ ہو گی۔ اگر کہیں بالفرض کوئی مہلت مل بھی جائے تو پھر دوبارہ مال کی محبّت عود کر آئے گی اور پھر تم اللہ کی راہ میں خرچ کرنے سے کنّی کتراؤ گے۔

❁❁❁

عشرۂ ذوالحجہ کی اہمیت وفضیلت اور فلسفۂ قربانی

حافظ عاطف وحید

(۶ جولائی ۲۰۲۱ء کو قرآن اکیڈمی لاہور میں تنظیم اسلامی کے ایک اجتماع سے خطاب)

خطبہ مسنونہ اور تلاوتِ آیات کے بعد!

آج مجھے جو عنوان دیا گیا ہے‘ وہ ہے: ’’عشرۂ ذوالحجہ کی اہمیت وفضیلت اور فلسفہ قربانی‘‘۔ یہ اصلاً دو الگ الگ عنوانات ہیں لیکن ان میں ایک باہمی تعلق ہے‘ اس لیے انہیں ایک ہی نشست کا عنوان بنا دیا گیا۔ قرآن حکیم کی متعدد آیات اس موضوع سے متعلق ہیں۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی زندگی کے بہت سے واقعات قرآن مجید میں مذکور ہیں جن کا تعلق اسی عنوان کے ساتھ ہے۔ کوشش کروں گا کہ چند باتیں جو مَیں آسانی سے اس محدود وقت میں کہہ سکوں وہ آپ کے گوش گزار کردوں۔ اس دعا کے ساتھ کہ جو بات مَیں کہوں‘ جو الفاظ میری زبان سے ادا ہوں‘ ایک تو وہ درست وصحیح ہوں اور پھر جو مَیں کہوں اس پر خود مجھے اور آپ سب کو عمل کرنے کی توفیق ہو۔

گلہائے رنگارنگ سے ہے زینتِ چمن!

اللہ تعالیٰ نے اس کائنات کا جو نظام بنایا ہے اس میں بہت تنوع ہے۔ یہاں یکسانیت (monotony) نہیں ہے۔ انسانوں کی طبیعتیں مختلف ہیں‘ ان کے رنگ مختلف ہیں‘ زبانیں مختلف ہیں‘ افتادِ طبع مختلف ہے۔ کُرّۂ ارض پر آپ گھومیں پھریں تو اللہ تعالیٰ کی اس بوقلمونی کے شاہکار ہر طرف نظر آئیں گے۔ بقول مرزا ابراہیم ذوقؔ:

گلہائے رنگارنگ سے ہے زینتِ چمن
اے ذوق اس جہاں کو ہے زیب اختلاف سے!

یہ اختلاف ہی درحقیقت اس کائنات کی زیب وزینت ہے۔ ہمیں یہ نظر آتا ہے کہ اللہ سبحانہ

وتعالیٰ نے مختلف موسم بنائے تو ان موسموں کے اثرات بھی مختلف ہیں۔ جو لوگ کھیتی باڑی کے کام سے وابستہ ہیں وہ اس بات کو خوب اچھے طور سے سمجھ سکتے ہیں کہ مختلف موسم مختلف قسم کے پھل پیداوار کے لیے مختص ہیں۔ اگر آپ نے کسی غلط موسم میں بیج بو دیے ہیں تو یہ ایک لاحاصل قسم کی محنت ہے۔ صحیح موسم میں صحیح وقت پر اگر کاشتکاری کی جاتی ہے تو اس سے صحیح نتیجہ برآمد ہوتا ہے‘ پھل کی پیداوار بڑھ کر آتی ہے۔ جس وقت پانی لگانا تھا اگر اس وقت نہیں لگایا تو پھر پیداوار نہیں ہوگی۔ جب نہیں لگانا تھا اگر اُس وقت لگا دیا‘ یا کثرت سے لگا دیا تو ہوسکتا ہے کہ پھل جل جائے‘ خراب ہو جائے۔ چنانچہ جہاں چیزوں کے اندر فرق ہے‘ تنوع ہے۔ وہیں ہر کام کے لیے ایک خاص اور موزوں وقت بھی ہے۔

بعینہٖ عبادات اور اعمالِ صالحہ کا معاملہ ہے۔ اگر آپ ایک مخصوص عبادت کو اس وقت سرانجام نہیں دیتے جو وقت اللہ تعالیٰ نے اس کے لیے مقرر کیا ہے تو وہ عبادت کوئی خاص نتیجہ برآمد نہیں کرے گی۔ یہ لاحاصل قسم کی ایک سرگرمی ہو کر رہ جائے گی۔ مثلاً حج ایک بڑی عظیم عبادت ہے۔ آپ اسے ذوالحجہ کی بجائے اگر کسی اور مہینے‘ مثلاً رجب میں سرانجام دیں گے تو نہ کوئی اجر ہے نہ ثواب‘ بلکہ ہوسکتا ہے کہ یہ وقت اور پیسے کا ضیاع ہو اور الٹا کسی معاملے میں گناہ بھی لازم آ جائے۔ رمضان المبارک ایک خاص مہینہ ہے جس میں اللہ تعالیٰ نے اجر و ثواب بڑھا دینے کے بہت سے وعدے کر رکھے ہیں۔ اس ماہ مبارک میں نیکی اور خیر کا ایک چھوٹا سا عمل بھی اللہ کی نگاہ میں کس قدر وقعت کا حامل ہے‘ احادیث مبارکہ اس پر شاہد ہیں۔ ایسا معاملہ کسی دوسرے مہینے میں نہیں ہے۔ رمضان کا آخری عشرہ نہایت فضیلت والا ہے اور لیلۃ القدر کی اپنی اہمیت و فضیلت ہے۔ باقی دن ایسے نہیں ہیں۔

تقویم کی اہمیت اور مختلف کیلنڈرز

یہ ہے وہ حقیقت جو اس کائنات کے اندر قائم تکوینی نظام سے ظاہر ہوتی ہے۔ اسی میں ایک ترتیب اور حکمت نظر آتی ہے۔ چنانچہ قرآن حکیم سے معلوم ہوتا ہے کہ جب سے یہ کائنات اللہ تعالیٰ نے تخلیق فرمائی تب سے ماہ و سال کی تقویم بارہ مہینوں کی ہے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿اِنَّ عِدَّةَ الشُّهُوْرِ عِنْدَ اللّٰهِ اثْنَا عَشَرَ شَهْرًا فِيْ كِتٰبِ اللّٰهِ يَوْمَ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ مِنْهَآ اَرْبَعَةٌ حُرُمٌ ۭ﴾ (التوبۃ:۳۶)

’’بے شک اللہ کے ہاں مہینوں کی تعداد بارہ ہے‘ اللہ کے قانون میں‘ جس دن سے اُس نے پیدا کیا آسمانوں اور زمین کو‘ان میں سے چار مہینے محترم ہیں۔‘‘

سال کے لیے عربی زبان میں اور قرآن حکیم کی اصطلاحات میں مختلف الفاظ استعمال ہوئے ہیں‘ جیسے سَنَۃٌ بھی ہے‘ عامٌ بھی ہے اور حَوْلٌ بھی ہے‘ لیکن مہینے کے لیے ایک ہی لفظ شَھْرٌ (جمع اشھر) استعمال ہوا۔اس کے بارے میں بڑی وضاحت کے ساتھ بتادیا گیا کہ جب سے آسمان اور زمین کی تخلیق ہوئی ہے‘ اللہ کی تقویم میں بارہ مہینے ہیں۔

یہ بارہ مہینے کون سے ہیں؟ اس بارے میں بھی انسانی تاریخ میں یہ نظر آتا ہے کہ بہت ابتدائی دور ہی سے دو مختلف تقویمات چلتی رہی ہیں۔زمانہ قبل از تاریخ میں ماہ وسال کا کوئی حساب نہیں رکھا جاتا تھا‘ اس کے بعد یہ سلسلہ شروع کیا گیا۔ چنانچہ ۴۶ قبل مسیح میں جولین سیزر کے دور میں ’’جولین کیلنڈر‘‘ اختراع کیا گیا۔اس کیلنڈر کی حقیقت یہ ہے کہ اس کا تعلق موسموں اور نظامِ شمسی کے ساتھ ہے۔اس کے بعد پندرہویں یا سولہویں صدی میں اسی جولین کیلنڈر میں کچھ معمولی تبدیلی کر کے ایک دوسرا کیلنڈر وجود میں لایا گیا جسے ’’گریگورین کیلنڈر‘‘ کہتے ہیں۔ یہ اور جولین کیلنڈر ایک دوسرے سے ملتے جلتے ہیں۔ایک اور کیلنڈر بھی بہت ابتدا سے جاری ہے‘ جسے قمری تقویم کے مطابق ’’لیونر (Lunar) کیلنڈر‘‘ کہتے ہیں۔اللہ تعالیٰ نے جو عبادات فرض کی ہیں ان میں ماہ وسال کے حساب کے لیے لیونر کیلنڈر ہی اختیار فرمایا‘ سولر کیلنڈر نہیں۔اس کی بھی حکمتیں ہیں۔ البتہ ۲۴ گھنٹے کے دوران عبادات کے لیے سولر کیلنڈر کی اہمیت ہے۔اس لیے کہ زمین کے ہر خطے کے اوپر ایک خاص وقت میں سورج نے نکلنا ہے‘ پھر نصف النہار تک پہنچنا ہے‘ پھر رفتہ رفتہ غروب ہونا ہے۔چنانچہ جن عبادات کا تعلق اوقات (timing) کے ساتھ ہے‘ انہیں سولر سسٹم (شمسی نظام) سے جوڑ دیا گیا اور جن عبادات کا تعلق ماہ وسال کے ساتھ ہے انہیں لیونر کیلنڈر (قمری نظام) سے جوڑ دیا گیا۔

چاند ایک ایسی شے ہے جس نے ہر آنگن میں طلوع ہونا ہے۔صحرا ہوں‘ پہاڑ ہوں‘ دریا ہوں‘ سمندر ہوں‘ وہاں کے رہنے والوں کو معلوم ہے کہ ایک دن آتا ہے جب چاند پیدا ہوتا ہے‘ پھر وہ بڑھتا ہے‘ اس کے بعد وہ ماہِ کامل بن جاتا ہے۔ پھر اس کے اندر کمی واقع ہوتی ہے اور پھر غائب ہوجاتا ہے۔ایک عام آدمی بھی چاند کو دیکھ کر ماہ وسال کا حساب رکھ سکتا ہے‘ اس کے لیے

سائنسی آلات کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ زمین کے ہر گوشے کے اوپر چاند کو سہولت کے ساتھ دیکھ کر یہ اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ مہینہ شروع ہوا کہ نہیں۔ چنانچہ جو عبادات سالانہ بنیاد پر ہیں جیسے رمضان المبارک کے روزے اور حج و قربانی وغیرہ‘ اللہ کی حکمت اسی بات کی متقاضی ہوئی کہ اسے چاند کے حساب کے ساتھ جوڑ دیا جائے تا کہ زمین کے کسی گوشے پر کوئی شخص موجود ہو وہ روزوں کا حساب رکھ سکے۔ اسی طریقے سے سال میں ایک دفعہ زکوٰۃ دینی ہے۔ ایک وقت وہ تھا جب کوئی کیلنڈر نہیں تھا تو سال کا حساب کیسے رکھا جاتا! سورج تو اپنے حساب سے نکلتا ہے‘ چلا جاتا ہے‘ لیکن تاریخ کا تو پتہ عام آدمی کو نہیں چلتا۔ چنانچہ زکوٰۃ کے لیے بھی اللہ تعالیٰ نے اسی قمری تقویم کو مقرر فرمایا۔ پھر عبادات میں جو سب سے افضل عبادت‘ سب سے جامع عبادت اور سب سے کامل بلکہ اکمل عبادت ہے یعنی حج کی عبادت‘ یہ بھی ایک خاص وقت اور ایک خاص مقام پر ہوتی ہے۔ چنانچہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے اس عبادت کو بھی چاند کی تقویم کے ساتھ جوڑ دیا تاکہ لوگوں کو پتا ہو کہ کس دن نکلنا ہے‘ کب پہنچنا ہے‘ کب یومِ ترویہ ہے‘ کب یومِ عرفہ ہے‘ کب یومِ نحر ہے‘ پھر ایامِ تشریق ہیں۔

اہلِ عرب کی نظامِ تقویم میں ردّوبدل

یہ تو اس کا ایک تاریخی پس منظر ہے‘ لیکن اسی کے اندر ایک اور چیز شامل کر لیجیے۔ اہل عرب کی معاش حج کے اجتماع کے ساتھ اور جو میلے ٹھیلے مختلف اوقات میں وہاں منعقد ہوتے تھے‘ ان سے وابستہ تھی۔ مکہ کی چھوٹی سی بستی تھی‘ وہاں پر کوئی بہت بڑی اکانومی نہیں تھی‘ لیکن لوگوں کے آنے سے معاشی سرگرمیوں میں ایک دم تیزی آ جاتی تھی۔ جب لوگوں کے آنے کا سلسلہ رک جاتا تو اکانومی ڈپریشن میں چلی جاتی۔ چنانچہ دورِ جاہلیت میں اہل عرب کو جب معلوم ہوا کہ ہماری اکانومی کا سارا دارومدار حج کے اجتماع کے ساتھ وابستہ ہے تو انہوں نے ایک طریقہ وضع کیا اور ایک نیا کیلنڈر وجود میں لائے جسے آج کی اصطلاح ’’لیونی سولر کیلنڈر‘‘ کہہ سکتے ہیں۔ یہ مجموعہ ہے لیونر اور سولر کا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ جب حج شدید گرمی یا شدید سردی میں آتا تو لوگوں کی آمد کم ہو جاتی کہ کون اتنی صعوبت برداشت کرے‘ چنانچہ خیال ہوتا کہ اس سال نہیں اگلے سال چلے جائیں گے۔ اس کا اثر اس چھوٹی سی اکانومی پر یہ ہوا کہ وہاں پر لوگوں کے لیے survive کرنا مشکل ہو گیا۔ مال نہیں آیا‘ تجارت نہیں ہوئی تو لوگ بدحال ہو جاتے۔ انہوں

نے جب یہ اندازہ لگالیا کہ لیونر اور سولر میں فرق کتنا ہے تو انہیں یہ بات سمجھ آئی کہ ایک سال میں تقریباً گیارہ دنوں کا فرق پڑتا ہے۔ اگر اس فرق کو کسی طرح پاٹ دیا جائے اور حج کو ہم اچھے موسم میں قائم رکھیں تو قافلہ حج کے شرکاء کوئی تکلیف اور تنگی محسوس نہیں کریں گے اور لوگ ذوق و شوق سے آئیں گے۔ چنانچہ قبائل کے عمائدین نے بیٹھ کر ایک ''کبیسہ'' کا مہینہ اختراع کیا۔ دوسرے سال یا تیسرے سال سولر کیلنڈر کے اندر وہ ایک مہینے کا اضافہ کر دیتے تھے۔ جب آٹھ سال کے بعد تین مہینوں کا اضافہ ہوگیا تو اس کا فائدہ یہ ہوا کہ اسی خاص موسم میں حج بھی آئے گا' اسی خاص موسم میں جو رمضان المبارک کے لیے انہوں نے طے کیا ہے رمضان بھی آئے گا اور اس طریقے سے موسموں کی شدّت سے بچت ہو جائے گی۔ اس کو قرآن مجید نے نَسِیْءُ کہا ہے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿اِنَّمَا النَّسِیْٓءُ زِیَادَۃٌ فِی الْکُفْرِ﴾ (التوبۃ:۳۷)

''یہ مہینوں کو ہٹا کر آگے پیچھے کر لینا تو کفر میں ایک اضافہ ہے۔''

قرآن کے مطابق نَسِیْءُ کفر میں ایک اضافہ ہے' یہ ان کی اپنی اختراع ہے۔ اور اس کو وہ بڑے فخر سے اس لیے پیش کرتے تھے کہ گویا انہوں نے ایسا کر کے لوگوں کے لیے آسانی پیدا کر دی ہے کہ لوگ سخت موسم کی پریشانی سے بچ جائیں اور اچھے موسم میں آئیں۔ دوسری طرف ان کا دعویٰ تھا کہ ہم نے ''اَشْہُرِ حُرُم'' کی تعداد بھی پوری قائم رکھ لی۔

ایک اور فائدہ وہ اسی سے یہ اٹھا لیتے تھے کہ اگر کسی سال کسی قبیلے پر چڑھائی کرنے کا یا کوئی قتل و غارت کا ارادہ ہے تو بھی سردار بیٹھ کر طے کر لیتے کہ اس سال ہم یہ اشہر حرم فلاں فلاں مہینے میں آگے بڑھا دیتے ہیں تاکہ اپنی اس جنگی کارروائی کے لیے ''حلال'' مہینے میسر آجائیں۔ اس لیے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے دور سے اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہ حکم تھا کہ اشہر حرم میں اپنی تمام جنگی سرگرمیاں اور مہم جوئیاں بند کر دی جائیں۔ اس کی یہ حکمت تھی کہ حج کے لیے آنے جانے والے لوگوں کے لیے امن و سکون فراہم ہو جائے۔ چنانچہ اسی طریقے سے کبھی وہ اپنی خواہشات کی تکمیل کے لیے اور کبھی تجارتی و کاروباری ضرورتوں کے پیش نظر ''کبیسہ'' کا مہینہ بڑھا کر لیونی سولر کیلنڈر کو اختیار کر لیتے۔ اور اس کو وہ اپنے تئیں بڑی دینداری کا کام سمجھتے کہ ہم نے لوگوں کے لیے آسانی کر دی ہے اور اللہ کا حکم بھی پورا رکھا۔ لیکن قرآن

کریم میں فرمادیا گیا:

﴿اِنَّمَا النَّسِیۡٓءُ زِیَادَۃٌ فِی الۡکُفۡرِ یُضَلُّ بِہِ الَّذِیۡنَ کَفَرُوۡا یُحِلُّوۡنَہٗ عَامًا وَّیُحَرِّمُوۡنَہٗ عَامًا لِّیُوَاطِـُٔوۡا عِدَّۃَ مَا حَرَّمَ اللّٰہُ فَیُحِلُّوۡا مَا حَرَّمَ اللّٰہُ ؕ﴾ (التوبۃ:۳۷)

’’یہ مہینوں کو ہٹا کر آگے پیچھے کر لینا تو کفر میں ایک اضافہ ہے‘ جس کے ذریعے سے گمراہی میں مبتلا کیے جاتے ہیں وہ لوگ جنہوں نے کفر کیا‘ ایک سال یہ لوگ حلال کر لیتے ہیں اس (مہینے) کو اور ایک سال اسے حرام قرار دے دیتے ہیں‘ تا کہ تعداد پوری کر لیں اس کی جو اللہ نے حرام ٹھہرائے ہیں‘ اور (اس طرح) حلال کر لیتے ہیں وہ (مہینہ) جو اللہ نے حرام کیا ہے۔‘‘

یہاں انداز بڑا اجلالی ہے۔ یعنی تم نے سمجھا کیا ہوا ہے! اللہ کی تقویم کو بگاڑ کے رکھ دیا‘ ہر چیز ہلا کر رکھ دی اور سمجھتے ہو کہ تم نے بڑا خیر کا کام کیا!

یہی وہ پس منظر ہے جو حجۃ الوداع کے موقع پر ملتا ہے جب رسول اللہ ﷺ نے یوم عرفہ کا خطبہ ارشاد فرمایا۔ اس وقت آپ ﷺ نے جو الفاظ اختیار فرمائے وہ بڑے خوبصورت تھے:

((اِنَّ الزَّمَانَ قَدِ اسْتَدَارَ کَهَیْئَتِهٖ یَوْمَ خَلَقَ اللّٰہُ السَّمَاوَاتِ وَالْاَرْضَ...)) (متفق علیہ)

یعنی زمانہ چکر لگا کر اپنی اس اصل ہیئت کی طرف لوٹ گیا ہے جس ہیئت پر اللہ ربّ العزت نے آسمان وزمین کو پیدا کیا تھا۔ اس لیے کہ یہ دن وہ تھا کہ جب کبیسہ کے مہینوں اور نسیء کا ہیر پھیر سب کا سب مشیتِ الٰہی سے ختم ہو کر حج اکبر کا دن اپنی اصل جگہ پر موجود تھا۔ گویا اس میں جو mismatch تھا وہ اس دن ختم ہوا تھا۔ اسی لیے آپ ﷺ نے ابتداءً بڑے غیر معمولی انداز میں پوچھا: ’’اے لوگو! آج کا دن کونسا دن ہے؟ یہ جگہ کون کونسی جگہ ہے؟‘‘ تا کہ لوگوں کو یہ بات مستحضر ہو جائے کہ یہ دن اور یہ جگہ ایسی اہم ہے۔ گویا تقویمات کے پہلو سے اللہ نے ایک reset بٹن دبا دیا۔ تمام گڑبڑیں اور ہیرا پھیریاں سب کی سب آج کے دن ختم ہو گئیں۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ کے ہاں یہ جو ماہ وسال کی تقویم ہے اس میں بعض عبادات کا تعلق لیونر کیلنڈر کے ساتھ ہے جبکہ فضیلت کا پہلو بھی اسی سے وابستہ ہے۔ اگر اسے ہٹا کر کسی اور جگہ

لے جائیں گے تو فضیلت ختم ہو جائے گی‘ اور وہ ایسے ہی ہے جیسے آپ نے بے موسمی کاشت کر دی ہے۔ اس سے نہ کوئی حاصل‘ نہ کوئی فائدہ اور نہ کوئی نتیجہ۔

اَشھُرِ حج اور اَشھُرِ حُرُم

اس ضمن میں یہ جو ﴿مِنۡهَاۤ اَرۡبَعَةٌ حُرُمٌ ؕ﴾ کا مَیں نے حوالہ دیا یہ بھی سمجھ لیجیے۔ قرآن حکیم میں شَھر اور اَشھُر کے حوالے سے ایک تو یہ بات بیان ہوئی ہے کہ بارہ مہینے ہیں جن میں سے چار محترم ہیں‘ جبکہ دوسری جگہ سورۃ البقرۃ میں فرمایا گیا:

﴿اَلۡحَجُّ اَشۡهُرٌ مَّعۡلُوۡمٰتٌ ۚ﴾ (آیت ۱۹۷) ’’حج کے معلوم مہینے ہیں۔‘‘

یعنی سال بھر میں اور کسی مہینے میں حج نہیں ہوتا۔ اس کا اپنا ایک وقت ہے۔ یہاں اَشھُر کا جو لفظ لایا گیا وہ جمع کا صیغہ ہے۔ اب اس کی بھی وضاحت درکار ہے کہ جمع کا اطلاق تین یا تین سے زیادہ پر ہوتا ہے تو کیا ان تینوں مہینوں میں جن کا ذکر اس آیۂ مبارکہ میں ہو رہا ہے‘ کسی بھی وقت حج کیا جا سکتا ہے یا اس سے مراد کچھ اور ہے؟ اہلِ تفسیر کے ہاں اس پر اجماع ہے کہ اس سے مراد یہ نہیں ہے کہ ان تین مہینوں میں آپ کسی بھی وقت حج کر لیں۔ حج کے ایام تو یہی ہیں‘ یعنی ۸ ذوالحجہ کو یہ سرگرمی شروع ہوتی ہے اور زیادہ سے زیادہ ۱۳ ذوالحجہ تک چلتی ہے۔ یہ پانچ چھ دن ہیں‘ البتہ اَشۡهُرٌ مَّعۡلُوۡمٰتٌ وہ مہینے ہیں جن میں کوئی شخص حج کا احرام باندھتا ہے‘ حج کا قصد کرتا ہے اور سفرِ حج اختیار کرتا ہے اور بالآخر خیریت و عافیت سے گھر واپس پہنچ جاتا ہے۔ ان تین مہینوں میں سے پہلا مہینہ ذوالقعدہ کا ہے جس میں کوئی شخص حج کا احرام باندھتا ہے۔ اس سے پہلے حج کا احرام باندھنا درست نہیں ہے۔ یہ تو آج کل سہولیات کا دور ہے کہ آپ شام کو احرام باندھتے ہیں اور اگلے دن عمرہ کر کے فارغ بھی ہو چکے ہوتے ہیں۔ اُس دور کو ذہن میں لائیے جب لوگ دور دراز سے ﴿مِنۡ كُلِّ فَجٍّ عَمِيۡقٍ ۝۲۷﴾ (الحج) پہنچتے تھے۔ احرام تو میقات سے باندھنے کا حکم ہے اور اس کے بعد بھی ہفتے بلکہ مہینے لگ جاتے تھے اور پھر کہیں جا کر وہ پہنچتے تھے۔ اس دوران پیدل سفر کر رہے ہیں یا بیل گاڑی پر۔ تو گویا قرآن نے واضح فرما دیا کہ اشھر حج کا تعلق احرام باندھنے‘ حج کا سفر اختیار کرنے اور واپس گھر تک پہنچنے سے ہے۔ ذوالقعدہ میں آپ نے احرام باندھا‘ ذوالحجہ میں آپ نے حج کیا‘ اس کے بعد کچھ وہاں قیام کیا۔ اپنے دل کی آرزوئیں اور تمنّائیں پوری کرتے رہے‘ جو نذر اور منّت مانی ہوئی

ہے وہ پوری کرتے رہے۔ پھر حسبِ توفیق عمرے کا بھی اہتمام کرلیا اور اس کے بعد واپس گھروں تک لوٹنا۔ یہ گویا تین مہینے بنتے ہیں کہ جن میں یہ activity پوری ہو رہی ہوتی ہے۔

گویا یوں سمجھئے کہ یہ مختلف دائرے ہیں۔ سال کا دائرہ' اشہر حرم کا دائرہ' اشہر حج کا دائرہ اور پھر ایّامِ حج کا دائرہ۔ ایک تو یہ کہ پورا سال کتنے مہینوں کا ہے' سال کی تقویم کیا ہے اور کس عبادت کے لیے کون سی تقویم اختیار کی گئی۔ اللہ چاہتا ہے کہ لوگ ہر موسم میں سفر حج کریں۔ یہ نہیں ہے کہ اس کے لیے ایک خاص موسم ہی مقرر رہے۔ دیکھا جائے تو جزیرہ نمائے عرب کے لیے بھی اسی میں فائدہ ہے۔ اگر ایک خاص موسم میں تو activity بہت ہوگئی لیکن باقی سارا سیزن مندے کا رہا تو اس میں ان کا نقصان ہے۔ ''نسیء'' کا چکر چلا کر وہ اپنے تئیں سمجھ رہے تھے کہ شاید ہمارا فائدہ ہے لیکن یہ بڑی عاقبت نااندیشی ہے۔ فائدہ تو اسی صورت میں ہے جب حج سال کے مختلف موسموں میں rotate کرتا رہے۔ اس اعتبار سے ایک موسمی دائرہ یہ ہے۔

پھر یہ سوال کہ اشہرِ حرم کون سے ہیں! تین تو وہی ہیں جو اشہُرِ حج ہیں یعنی ذوالقعدہ' ذوالحجہ اور محرم جبکہ چوتھا مہینہ رجب کا ہے۔ رجب کے مہینے کی حکمت بظاہر یہی نظر آتی ہے کہ عربوں کی روایات میں وہ اس مہینے میں عمرہ کو فضیلت کا باعث سمجھتے تھے۔ محسوس یہ ہوتا ہے کہ جب لوگوں نے اس کو اختیار کیا تو اللہ نے بھی ان پر یہی چیز مقرر فرمادی۔ جیسے یہود کے ساتھ ہوتا رہا کہ انہوں نے سبت کا دن اپنے لیے پسند کیا تو اللہ تعالیٰ نے اسے ہی ان کے لیے عبادت کے لیے مختص دن بنا دیا۔ یہ چار مہینے کیوں محترم ہیں؟ ذوالقعدہ کے لفظ ہی سے نظر آرہا ہے کہ اس کے اندر بیٹھ جانے کا کہا گیا ہے۔ وہ مہینہ جس میں اپنی تمام مہم جوئیاں ترک کردو تاکہ عازمین کے لیے سفر حج آسان رہے۔ کوئی لوٹ مار' ماردھاڑ' پکڑ دھکڑ نہ ہو۔ ذوالحجہ کا لفظ ہی بتا رہا ہے کہ یہ وہ مہینہ ہے جس کے اندر حج کے مناسک ادا ہونے ہیں۔ اس اعتبار سے یہ اللہ کی تقویم ہے۔ حج کی عبادت اتنی عظیم ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس کو سہولت کے ساتھ عمل درآمد کروانے کے لیے تین اور مہینوں کو مقدس ٹھہرا دیا' اور ہر قسم کی مہم جوئی کو اس میں ختم کرنے کا حکم دے دیا۔

حج اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کی عظیم شخصیت

اگلا نکتہ یہ ہے کہ حج کی عبادت تو حضرت آدم علیہ السلام کے دور سے مقرّر ہے۔ بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے پیدل حج کیا۔ ان کی بڑی طویل عمر تھی اور بعض روایات کے

مطابق انہوں نے کثیر تعداد میں حج ادا کیے ہیں۔ البتہ اس عبادت کو ایک خاص رنگ‘ شکل اور ہیئت نصیب ہوئی حضرت ابراہیم علیہ السلام کی شخصیت سے۔

حج کی عبادت کو حضرت ابراہیم علیہ السلام کی شخصیت سے ایک خاص نسبت ہے جبکہ عمرے کی عبادت کو ان کی اہلیہ حضرت ہاجرہ سلامٌ علیہا کے ساتھ ایک خاص نسبت ہے‘ خاص طور پر سعی بین الصفا والمروہ تو ہے ہی ان کی ایک یادگار۔ باقی طواف بیت اللہ شریف تو بالکل ابتدا ہی سے تھا۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی شخصیت محبّت‘ سپردگی اور وارفتگی سے عبارت ہے؟ ان کا زمانہ ماقبل تاریخ ہے۔ ہمیں واضح طور پر معلوم نہیں کہ وہ کتنے قبل مسیح میں تھے۔ ایک تخمینہ یہ ہے کہ دو ہزار قبل مسیح سے پانچ ہزار قبل مسیح تک۔ یہ بہت بڑا دورانیہ ہے جس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام اس میں سے کسی دور میں تھے۔ ایک ایسی شخصیت جس کا قرآن حکیم نے اُن کے نام کے ساتھ تذکرہ کم و بیش ستر مرتبہ کیا ہے۔ اُس وقت کی تہذیب کیا ہوگی؟ تمدن کیسا ہوگا؟ آبادی کتنی ہوگی؟ لوگوں کا رہن سہن کیسا ہوگا؟ اوسطاً چار ہزار برس پرانی شخصیت لیکن شخصیت کے اندر کوئی ایسا کرشمہ ہے‘ ایسی کوئی جاذبیت ہے کہ قرآن میں ان کا تذکرہ کیا جاتا ہے تو ایسا لگتا ہے کہ گویا یہ کوئی قابلِ رشک ہستی ہے۔ چند آیات حوالے کے طور پر پیش ہیں۔ سورۃ البقرۃ میں فرمایا:

﴿وَاِذِ ابۡتَلٰۤی اِبۡرٰهٖمَ رَبُّهٗ بِكَلِمٰتٍ فَاَتَمَّهُنَّ ؕ﴾ (آیت ۱۲۴)

’’اور ذرا یاد کرو جب ابراہیمؑ کو آزمایا اُس کے رب نے بہت سی باتوں میں تو اُس نے ان سب کو پورا کر دکھایا۔‘‘

یہاں اللہ تعالیٰ ایک سرٹیفکیشن عطا فرما رہے ہیں کہ جب اللہ نے انہیں بڑی بڑی آزمائشوں میں جانچا اور وہ تمام آزمائشوں میں پورے اترے تو اللہ نے فرمایا: ﴿اِنِّیۡ جَاعِلُكَ لِلنَّاسِ اِمَامًا ؕ﴾ ’’میں تمہیں تمام انسانوں کا امام بناتا ہوں‘‘۔ اگلی آیت میں فرمایا:

﴿وَاِذۡ جَعَلۡنَا الۡبَيۡتَ مَثَابَةً لِّلنَّاسِ وَاَمۡنًا ؕ وَاتَّخِذُوۡا مِنۡ مَّقَامِ اِبۡرٰهٖمَ مُصَلًّی ؕ﴾ (آیت ۱۲۵)

’’اور یاد کرو جب ہم نے اس گھر (بیت اللہ) کو قرار دے دیا لوگوں کے لیے اجتماع (اور زیارت) کی جگہ اور اُسے امن کا گھر قرار دے دیا۔ اور (ہم نے حکم دیا کہ)

مقامِ ابراہیمؑ کو اپنی نماز پڑھنے کی جگہ بنالو۔‘‘

اللہ سبحانہ وتعالیٰ کے تمام نام لیواؤں کو حکم ہو رہا ہے کہ مقامِ ابراہیم کو اپنی نماز کی جگہ بنالو۔ نسبت حضرت ابراہیم علیہ السلام کے ساتھ قائم ہو رہی ہے۔ سورۃ آلِ عمران میں بھی اسی مقامِ ابراہیم کا تذکرہ ہے۔ فرمایا:

﴿فِیۡہِ اٰیٰتٌۢ بَیِّنٰتٌ مَّقَامُ اِبۡرٰہِیۡمَ ۬ۚ﴾ (آیت ۹۷)

’’اس میں بڑی واضح نشانیاں ہیں‘ جیسے مقامِ ابراہیمؑ۔‘‘

یعنی اس ارضِ حرام کے اندر بڑی واضح نشانیاں ہیں۔ اللہ کی توحید‘ اُس کی خلاقیت‘ اُس کی ربوبیت کی بڑی بڑی نشانیاں۔ انہی میں سے ایک ہے مقامِ ابراہیم جس کی نسبت حضرت ابراہیم علیہ السلام کی طرف ہے۔ سورۃ البقرۃ میں فرمایا:

﴿وَ مَنۡ یَّرۡغَبُ عَنۡ مِّلَّۃِ اِبۡرٰہٖمَ اِلَّا مَنۡ سَفِہَ نَفۡسَہٗ ؕ﴾ (آیت ۱۳۰)

’’اور کون ہوگا جو ابراہیمؑ کے طریقے سے منہ موڑے؟ سوائے اُس کے جس نے اپنے آپ کو حماقت ہی میں مبتلا کرنے کا فیصلہ کرلیا ہو!‘‘

ابراہیم علیہ السلام کے طریقہ سے انحراف وہی کر سکتا ہے کہ جس کی مت ماری گئی ہو۔ جس نے ابراہیم علیہ السلام کے راستے یا اُنؑ کے طور طریقے سے انحراف کیا اُس نے اپنے آپ کو حماقت میں مبتلا کر دیا۔ پھر سورۃ آلِ عمران میں فرمایا:

﴿مَا کَانَ اِبۡرٰہِیۡمُ یَہُوۡدِیًّا وَّ لَا نَصۡرَانِیًّا وَّ لٰکِنۡ کَانَ حَنِیۡفًا مُّسۡلِمًا ؕ﴾ (آیت ۶۷)

’’ابراہیمؑ نہ تو یہودی تھے نہ نصرانی تھے بلکہ وہ تو بالکل یکسو ہو کر اللہ کے فرماں بردار تھے۔‘‘

یہ کوئی مائیکروسافٹ کی سرٹیفکیشن نہیں ہے‘ بلکہ ربّ العالمین کی طرف سے گواہی دی جا رہی ہے کہ وہ حنیف مسلمان تھے‘ یعنی ایسا بندہ جس کے اندر شرک کا ذرا بھی شائبہ نہ ہو‘ اُس کے عقیدے اور عمل میں کوئی ذرا سی بھی آمیزش نہ ہو۔

﴿قُلۡ صَدَقَ اللّٰہُ ۟ فَاتَّبِعُوۡا مِلَّۃَ اِبۡرٰہِیۡمَ حَنِیۡفًا ؕ وَ مَا کَانَ مِنَ الۡمُشۡرِکِیۡنَ ﴿۹۵﴾﴾ (آل عمران)

’’کہہ دیجیے اللہ نے جو کچھ فرمایا ہے سچ فرمایا ہے‘ پس پیروی کرو ملّتِ ابراہیم کی جو یکسو تھے۔ اور وہ مشرکین میں سے نہیں تھے۔‘‘

سورۃ النساء میں فرمایا:

﴿وَمَنْ اَحْسَنُ دِيْنًا مِّمَّنْ اَسْلَمَ وَجْهَهٗ لِلّٰهِ وَهُوَ مُحْسِنٌ وَّاتَّبَعَ مِلَّةَ اِبْرٰهِيْمَ حَنِيْفًا ؕ﴾ (آیت ۱۲۵)

''اور اُس سے بہتر دین کس کا ہو گا جس نے اپنا چہرہ (سر) اللہ کے سامنے جھکا دیا' اور (اس کے بعد) احسان (کے درجے) تک پہنچ گیا اور اُس نے پیروی کی دین ابراہیمؑ کی یکسو ہو کر (یا پیروی کی اُس ابراہیمؑ کے دین کی' جو یکسو تھا)۔''

اور پھر وہیں فرمایا:

﴿وَاتَّخَذَ اللّٰهُ اِبْرٰهِيْمَ خَلِيْلًا ﴿۱۲۵﴾﴾

''اور اللہ نے تو ابراہیم (علیہ السلام) کو اپنا دوست بنا لیا تھا۔''

چار ہزار برس قبل کی ایک شخصیت کو خود اللہ نے اپنا دوست قرار دے دیا۔ سورۃ الانعام میں فرمایا:

﴿قُلْ اِنَّنِيْ هَدٰىنِيْ رَبِّيْۤ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ۚ۬ دِيْنًا قِيَمًا مِّلَّةَ اِبْرٰهِيْمَ حَنِيْفًا ۚ﴾ (آیت ۱۶۱)

''(اے نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم!) کہیے کہ میرے ربّ نے تو مجھے ہدایت دے دی ہے سیدھے راستے کی طرف۔ وہ دین ہے سیدھا جس میں کوئی ٹیڑھ نہیں اور ملّت ہے ابراہیم کی' جو یکسو تھا (اللہ کی طرف)۔''

سورۃ ھود میں فرمایا:

﴿اِنَّ اِبْرٰهِيْمَ لَحَلِيْمٌ اَوَّاهٌ مُّنِيْبٌ ﴿۷۵﴾﴾

''یقیناً ابراہیمؑ بہت ہی بردبار' نرم دل اور اللہ کی جناب میں رجوع کرنے والے تھے۔''

یعنی جو اعلیٰ ترین صفات ممکن ہوسکتی ہیں وہ ان کی ذات میں جمع کر دی گئیں۔ یہاں فرمایا کہ وہ حلیم تھے' بہت بردبار' بڑے صاحب تحمل۔ بہت نرم دل اور انابت کرنے والے' اللہ کی طرف رجوع کرنے والے۔ سورۃ النحل میں فرمایا:

﴿اِنَّ اِبْرٰهِيْمَ كَانَ اُمَّةً قَانِتًا لِّلّٰهِ حَنِيْفًا ؕ﴾ (آیت ۱۲۰)

''یقیناً ابراہیمؑ ایک اُمّت تھے' اللہ کے لیے فرمانبردار اور یکسو۔''

سورۂ مریم میں فرمایا:

﴿وَاذْكُرْ فِى الْكِتٰبِ اِبْرٰهِيْمَ ؕ اِنَّهٗ كَانَ صِدِّيْقًا نَّبِيًّا ﴿۴۱﴾﴾

''اور تذکرہ کیجیے اس کتاب میں ابراہیمؑ کا۔ یقیناً وہ صدیق نبی تھے۔''

حضرت ابراہیم علیہ السلام کا آگ میں ڈالا جانا!

پوری انسانی تاریخ میں ایک منفرد واقعہ ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو آگ میں ڈالا گیا۔ یہ واقعہ ابراہیم علیہ السلام کی زندگی کا ایک ایسا واقعہ ہے جو ہر صاحب ایمان کے دل پر لکھا ہونا چاہیے۔ قبیلے کی سب سے ہونہار شخصیت ہیں۔ نوجوان ہیں‘ جن سے بڑی امیدیں ہوتی ہیں۔ خاندان بھی بہت اعلیٰ ہے۔ باپ صرف معبد کا پروہت ہی نہیں ہے بلکہ معبد کے اندر بُت تراشنے کی ذمہ داری بھی اسی کی‘ یعنی ایک بہت بڑا ماہر فن۔ وہاں انہیں اندازہ ہوا کہ یہ ستارہ پرستی اور بُت پرستی تو اللہ عزّوجل کے حق پر ڈاکہ ہے۔ جب اللہ کی توحید کی معرفت حاصل ہوگئی تو کیا بیتی ہوگی اس نوجوان کے دل پر!

پھر کئی دفعہ قوم کو سمجھا کر فیصلہ کرلیا کہ اب انہیں ایک زوردار جھٹکا دینا ہے‘ اس کے بغیر یہ لوگ ٹس سے مَس ہونے والے نہیں ہیں۔ اب یہ بُت پرستی کے ایسے خوگر ہو گئے ہیں کہ کوئی بات سننے کو تیار نہیں۔ چنانچہ موقع ملنے پر گھس گئے معبد میں اور بتوں کو توڑ کر برابر کر دیا۔ ایک بڑے بُت کو چھوڑ دیا اور اسی کے کندھے پر کلہاڑا بھی رکھ دیا تاکہ واقعاتی شہادت (circumstantail evidence) بھی اسی کی طرف راہنمائی کرے‘ قاتل یہی سمجھا جائے۔ چنانچہ جب لوگوں نے پوچھا تو کہا کہ اس بڑے سے پوچھ لو‘ یہ کھڑا ہوا ہے‘ دیکھ رہا ہے چاروں طرف۔ اور آلۂ واردات بھی اسی کے پاس سے برآمد ہو رہا ہے۔ یہ ہے وہ لمحہ کہ جس میں ان کے اندر ایسی سوچ پیدا ہوئی کہ ایک دفعہ تو سب ہل کے رہ گئے اور ان کے سر جھک گئے۔ پھر کہنے لگے: ’’اے ابراہیم! تم تو جانتے ہو کہ یہ بات نہیں کر سکتے۔‘‘ کیسے پوچھ لیں اس سے؟‘‘ اس پر فرمایا: ’’تف ہے تم پر اور تمہارے ان معبودانِ باطل پر۔ کیا تم عقل نہیں رکھتے؟‘‘ ان کو پوجتے ہو‘ ان سے اُمیدیں لگائی ہوئی ہیں‘ ان کے آسرے ہیں جو اتنے بے بس ہیں!

ایک دفعہ چونکنے اور جھٹکا کھانے کے بعد اپنے ہی قبیلے کے لوگوں کو غلطی کا احساس تو ہوا لیکن ان کے دار الندوہ میں بجائے ندامت کے اپنی غلطی پر مصر رہنے کا فیصلہ ہوگیا کہ اب اپنے معبودوں کی عزت کو بچاؤ‘ ان کی مدد کرو! ﴿قَالُوۡا حَرِّقُوۡهُ وَانۡصُرُوۡۤا اٰلِهَتَكُمۡ اِنۡ كُنۡتُمۡ فٰعِلِيۡنَ ﴿۶۸﴾﴾ (الانبیاء) ’’کہنے لگے: اس کو جلا ڈالو اور اپنے معبودوں کی مدد کرو اگر تم نے کچھ کرنا ہے!‘‘ آج اگر اس دعوت کو ہم نے پھلنے پھولنے دیا تو کل ہماری تہذیب تباہ

ہو جائے گی۔ اسے ایسی سزا دو کہ آئندہ کسی نوجوان کو کبھی بھی دوبارہ یہ سوچنے کی جرأت نہ ہو کہ یہ درسِ توحید بھی کوئی حقیقت تھا‘ ابراہیمؑ نے بھی کوئی پیغام دیا تھا! وہ سزا یہ ہے کہ انہیں کے سامنے آگ میں ڈال دو! اپنے ہی گھر والے آگ میں ڈالنے کی تیاریاں کر رہے ہیں۔ وہ باپ جس سے انہیں بہت محبّت ہے‘ لکڑیاں جمع کرتا پھر رہا ہے۔ دوسرے لوگ بھی بڑھ چڑھ کر حصّہ لے رہے ہیں۔ جرم کیا ہے؟ ایک کلمہ توحید ادا کیا ہے جو ایسا کلمۂ حق ہے جس سے بڑا کوئی حق نہیں۔ ہم میں سے کسی کو ذرا دین کی خدمت کی توفیق نصیب ہوتی ہے تو اس کا دماغ ہی چڑھ جاتا ہے‘ پیر زمین پر نہیں رہتے۔ ابراہیم علیہ السلام پوری آبادی میں اکیلے ہیں۔ ایسی تنہائی کہ کوئی ایک شخص بھی نہیں جو آ کر کہے کہ اے ابراہیم تمہارے ساتھ بڑا ظلم ہو رہا ہے‘ بڑی زیادتی ہو رہی ہے۔ میرا خیال ہے کہ انسانی تاریخ میں ایسی تنہائی (loneliness) کبھی کسی کو لاحق نہیں ہوئی ہو گی۔ بالآخر اپنے بس پڑتے انہوں نے وہ کام کر ڈالا۔

اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کو آزماتا ہے‘ یہ ایک آزمائش تھی‘ لیکن اس کے بعد پھر اللہ تعالیٰ اپنے نبیوں اور رسولوں کو بچاتا بھی ہے۔ چنانچہ ارشادِ باری تعالیٰ ہوا:

﴿قُلۡنَا یٰنَارُ کُوۡنِیۡ بَرۡدًا وَّ سَلٰمًا عَلٰۤی اِبۡرٰہِیۡمَ ﴿۶۹﴾﴾ (الانبیاء)

’’ہم نے حکم دیا: اے آگ! تُو ٹھنڈی ہو جا اور سلامتی بن جا ابراہیمؑ پر۔‘‘

رسولوں کے باب میں اللہ تعالیٰ کا اصول یہ ہے:

﴿کَتَبَ اللّٰہُ لَاَغۡلِبَنَّ اَنَا وَ رُسُلِیۡ ؕ﴾ (المجادلة:۲۱)

’’اللہ نے لکھ دیا ہے کہ یقیناً مَیں غالب رہوں گا اور میرے رسول۔‘‘

پھر سورۃ الصافات میں فرمایا:

﴿سَلٰمٌ عَلٰۤی اِبۡرٰہِیۡمَ ﴿۱۰۹﴾﴾

’’سلام ہو ابراہیمؑ پر۔‘‘

سورۃ النجم میں فرمایا:

﴿وَ اِبۡرٰہِیۡمَ الَّذِیۡ وَفّٰۤی ﴿۳۷﴾﴾

’’وہ ابراہیمؑ جس نے وفاداری کا حق ادا کر دیا۔‘‘

ایسی عظیم ہستی جس کی وفاداری کی شہادت ربّ العالمین دے رہے ہیں۔ اور پھر فرمایا:

﴿قَدۡ كَانَتۡ لَكُمۡ اُسۡوَةٌ حَسَنَةٌ فِيۡۤ اِبۡرٰهِيۡمَ﴾ (الممتحنة:۵)

’’(اے مسلمانو!) تمہارے لیے بھی ابراہیمؑ کی شخصیت میں اُسوہ حسنہ ہے۔‘‘

اور واحد کے صیغے سے رسول اللہ ﷺ کو بھی خطاب کر کے فرمایا گیا:

﴿ثُمَّ اَوۡحَيۡنَاۤ اِلَيۡكَ اَنِ اتَّبِعۡ مِلَّةَ اِبۡرٰهِيۡمَ حَنِيۡفًا﴾ (النحل:۱۲۳)

’’پھر (اے محمد ﷺ!) ہم نے وحی کی آپ کی طرف کہ پیروی کیجیے مِلّتِ ابراہیمؑ کی یکسو ہو کر۔‘‘

حضرت ابراہیم علیہ السلام کی دو بڑی آزمائشیں

یہ ہے ابراہیم علیہ السلام کا مختصر سا تعارف۔ ان کی زندگی میں جو ابتلائیں اور آزمائشیں ہیں وہ ابتدا سے ہی ہیں لیکن دو آزمائشیں اتنی سخت تھیں جن کو بیان کرنے سے زبان قاصر ہے۔

(۱) بیوی اور شیر خوار بچے کو دور افتادہ غیر آباد علاقے میں چھوڑنے کا حکم: ایک وہ جب حکم ہوا کہ اپنی بیوی اور شیر خوار بچے کو لے کر فلسطین (شام) کے علاقے سے نکل کھڑے ہو! اس کا پس منظر کیا ہے‘ قرآن نے اس بارے میں تفصیلات بیان نہیں کیں۔ روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کی پہلی بیوی حضرت سارہ تھیں‘ جو اُن کے آبائی علاقے سے تھیں۔ دوسری بیوی حضرت ہاجرہ کا تعلق ایک شاہی خاندان سے تھا۔ وہ ایک قبیلے کے سردار کی بیٹی تھیں۔ یہود ونصاریٰ نے مشہور یہ کیا ہے کہ شاید وہ کوئی باندی تھیں‘ جب کہ حقیقت اس کے برعکس ہے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام اور حضرت ہاجرہ کے درمیان عمر کا فرق بھی بہت زیادہ تھا۔ حضرت سارہ سے اولاد نہیں ہوئی تھی‘ جبکہ حضرت ہاجرہ سے بھی اولاد بہت تاخیر سے ہوئی ہے۔ آپؑ نے بڑھاپے میں اللہ تعالیٰ سے دعا کی:

﴿رَبِّ هَبۡ لِيۡ مِنَ الصّٰلِحِيۡنَ ۝۱۰۰﴾ (الصافات)

’’پروردگار! مجھے ایک صالح بیٹا عطا فرما‘‘۔

﴿فَبَشَّرۡنٰهُ بِغُلٰمٍ حَلِيۡمٍ ۝۱۰۱﴾ (الصافات)

’’تو ہم نے اُسے بشارت دی ایک حلیم الطبع لڑکے کی۔‘‘

غلام حلیم سے حضرت اسماعیل علیہ السلام مراد ہیں‘ جو اللہ تعالیٰ نے تقریباً ۸۵ برس کی عمر میں عطا فرمائے۔ یہ اولاد جہاں ان کی اور ان کی اہلیہ کی آنکھوں کی ٹھنڈک تھی وہیں بوجوہ پہلی اہلیہ سارہ

کے لیے آزمائش کا سبب بن گئی کہ جنابِ ابراہیمؑ کی بھی زیادہ توجّہ اسی طرف ہے‘ ہر طرف اسماعیلؑ کا تذکرہ ہو رہا ہے۔ یہ انسانی طبیعت کی کمزوریاں ہوتی ہیں۔

دس پندرہ برس جو حضرت ہاجرہ اور حضرت ابراہیم کی زوجیت کا دور گزرا اس دوران حضرت ہاجرہ کی حیرت انگیز صفات کا نمایاں اظہار اس موقع پر ہوا ہے جب حضرت ابراہیم علیہ السلام انہیں بیابان میں چھوڑ کر چلے جانے کے لیے نکلے۔ اللہ تعالیٰ کی طرف سے حکم ہوا کہ انہیں لے کر چل پڑو۔ کہاں جانا ہے‘ یہ نہیں بتایا گیا۔ حضرت جبریل علیہ السلام کو بھیجا گیا کہ وہ راہنمائی کریں۔ وہ انہیں اپنے ہمراہ شام سے لے کر روانہ ہوئے۔ چار افراد ہیں اور دو سواریاں ہیں۔ سینکڑوں میل چل چل کر ایسے ایسے علاقوں میں سے بھی گزرے ہیں کہ جہاں پر ایک دفعہ خوف ہوتا تھا کہ یہیں رکنے کا حکم نہ ہو جائے‘ یہاں تو کچھ بھی نہیں ہے۔ سیاہ پتھر ہیں‘ کوئی دانہ نہیں‘ کوئی پانی نہیں۔ چلتے چلتے اس جگہ پہنچے جہاں کسی دور میں بیت اللہ کے آثار تھے۔ یہ علاقہ بھی بالکل غیر آباد (بِوَادٍ غَیْرِ ذِیْ ذَرْعٍ) تھا۔ کچھ بھی نہیں تھا یہاں پر۔ حضرت جبریلؑ نے بیت اللہ شریف کی نشاندہی کر دی اور کہا کہ یہاں چھوڑ کر جانا ہے۔ ایک دفعہ تو شاید اُن کے اوسان خطا ہو گئے ہوں گے کہ مَیں انہیں یہاں چھوڑ کر جاؤں! یہاں تو پانی بھی نہیں ہے۔ جو پانی ساتھ لائے ہیں وہ کتنی دیر چلے گا! حضرت ہاجرہ بھی پریشان ہیں کہ کہاں اترنے کا حکم آیا ہے۔ اس کے بعد وہ کچھ کہہ بھی نہیں پا رہے‘ بتا بھی نہیں سکتے۔

جو چند دن یہاں ٹھہرے تھے‘ اس میں آپؑ یہی کر سکتے تھے کہ ایک چھپڑ سا بنانے کوشش کی تاکہ ایک سایہ میسّر آ جائے۔ اس کے بعد نکل کھڑے ہوئے۔ بعض روایات میں آتا ہے کہ جب حضرت ابراہیم علیہ السلام انہیں چھوڑ کر جا رہے تھے وہ تین سے چار میل پیچھے پیچھے بھاگتی آ رہی تھیں کہ آپ کہاں جا رہے ہیں‘ ہمیں یہاں چھوڑ کر کیوں جا رہے ہیں؟ بالآخر اس اللہ کی بندی کو احساس ہو گیا کہ یہ اللہ کا حکم ہے۔ جب انہوں نے دریافت کیا تو حضرت ابراہیم علیہ السلام نے صرف اثبات میں سر ہلا دیا کہ ہاں یہ اللہ کا حکم ہے! اور پھر چلے گئے۔ اللہ کے حکم کو پورا کرنا ہی گویا ان کا مقصدِ حیات تھا۔ اس پر حضرت ہاجرہ نے بھی کوئی شکوہ نہیں کیا۔ یہی فرمایا کہ اگر یہ اللہ کا حکم ہے تو اللہ ہمیں ضائع نہیں کرے گا۔

سورج نکلا تو ہر طرف آگ برس رہی تھی۔ پانی بھی تھوڑا تھوڑا کر کے ختم ہو گیا۔ شیر خوار بچہ

ساتھ ہے۔ محسوس ہوتا ہے کہ یہ بھی انسانی تاریخ کا ایک ایسا دلربا واقعہ ہے جو دلوں کو کھینچ کر رکھ دے۔ حضرت ہاجرہ پانی کی تلاش میں صفا و مروہ کے درمیان دوڑ رہی ہیں۔ ہموار سطح پر دور تک چلی گئیں تو بھی بچہ دور سے نظر آرہا ہے لیکن جب ذرا گھاٹی کے اندر گئیں تو بچہ نظر نہیں آرہا۔ چنانچہ پھر دوڑ کر واپس جاتی تھیں کہ دیکھیں بچہ موجود ہے یا نہیں۔ معلوم یہ ہوتا ہے کہ وہ چکر لگا لگا کر تھک کر گر گئیں۔ اس موقع پر اللہ تعالیٰ نے حضرت جبریل امینؑ کو بھیجا اور وہاں پانی کا چشمہ برآمد ہوگیا۔ یہ ایک معجزہ تھا جو آج بھی چشمِ عالَم کے لیے معجزہ ہے۔ آج تک کوئی نہیں بتا سکا کہ یہ پانی کہاں سے آرہا ہے' اس کے سوتے کون سے کاریزوں اور ریز روائر سے ملے ہوئے ہیں!

حضرت ہاجرہ کے ساتھ یہ معاملہ کیوں ہوا؟ دراصل یہ بنیاد ڈالی جارہی تھی' ایک بڑی شخصیت کی آمد کی تیاری کی۔ نبی آخر الزماں حضرت اسماعیل علیہ السلام کی اولاد میں سے ہوں گے۔ جتنی بڑی عمارت ہو اُس کی اتنی ہی گہری بنیادیں بنائی جاتی ہیں۔ اللہ تعالیٰ قادر ہے' وہ چاہتا تو ان کو یہ چکر نہ لگانے پڑتے' یہ وقت نہ دکھایا جاتا' ان پر یہ آزمائش نہ آتی۔ اللہ تعالیٰ انہیں وہاں ایک بہترین سا محل دے دیتا' جس میں سارے انتظامات بھی ہو جاتے۔ اللہ چاہتا تو سب کچھ ہوسکتا تھا' لیکن اللہ تعالیٰ کے حکم سے ہی حضرت ابراہیم علیہ السلام بالکل بے آسرا چھوڑ کر گئے۔ یہ ہے اصل میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کا امتحان اور یہ ہے حضرت ہاجرہ کا کردار اور ان کی شخصیت۔ شاید اس سے بڑی کوئی ابتلا ممکن نہ ہو۔ پھر یہ کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو یہ اجازت بھی نہیں تھی کہ جا کر مل ہی آئیں۔ سال کے بعد پہلی مرتبہ اجازت ہوئی ہے تو وہ بھی اس طرح کہ بس جاؤ' دیکھ لو اور واپس آجاؤ۔ بیوی اور بچے کے ساتھ کچھ وقت گزارنے کی اجازت نہیں۔ یہاں حضرت ہاجرہ ہی اس بچے کو پال رہی ہیں' اس کی تربیت ہو رہی ہے' وہ بڑا ہو رہا ہے۔

(۲) نوجوان بیٹے حضرت اسماعیل علیہ السلام کی قربانی: ایک موقع پر حضرت ابراہیم علیہ السلام نے خواب دیکھا کہ اپنی کوئی قیمتی چیز اللہ کی راہ میں قربان کر دو۔ ایک سیلانی مزاج ہستی کے پاس کیا ہوسکتا ہے! اونٹ ہیں' بکریاں ہیں۔ تو حضرت ابراہیم علیہ السلام نے ان میں سب سے خوبصورت چیز نکالی اور اللہ کی راہ میں دے دی۔ پھر خواب آیا کہ نہیں' خوبصورت ترین اور محبوب ترین چیز اللہ کی راہ میں قربان کرو! پہلے کافی مال اللہ کی راہ میں قربان کیا' لیکن پھر ذہن اس طرف منتقل ہوا کہ ایک اور محبوب شے بھی ہے۔ یعنی اپنا بچہ جو اب بھاگ دوڑ کی عمر کو پہنچ گیا تھا۔ چنانچہ وہیں

سے ارادہ کر کے چل پڑے کہ اللہ کے حکم کے آگے ہر چیز ہیچ ہے۔ لہٰذا اب وہ بچے کو قربان کرنے کے لیے سفر کر رہے ہیں۔ ظاہر ہے یہاں آکر ماں کو بتا تو نہیں سکتے تھے کہ مَیں کس لیے آیا ہوں‘ صرف ایک بہانے سے بچے کو لے کر نکلے ہیں۔ یہ کوئی آزمائش سی آزمائش ہے‘ اس کو تو بیان کرنا بھی ممکن نہیں۔ قربانی کا فلسفہ تو درحقیقت حضرت ابراہیم علیہ السلام کی شخصیت ہے جو مجسم قربانی ہے۔ کوئی اور بات اس میں کہنے کی ہے ہی نہیں۔ انہوں نے وہ کر دیا جو کوئی انسان شاید کبھی سوچ بھی نہیں سکتا۔ اس قربانی کو اللہ تعالیٰ نے رہتی دنیا تک اپنا نام لینے والوں کے لیے ایک علامت بنا دیا۔ جو بھی اللہ کا نام لیوا ہے اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کے ساتھ نسبت قائم کرتا ہے اسے یہ یاد رکھنا چاہیے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے کیا کیا قربانیاں دی ہیں۔ اللہ کی رضا کے لیے اُس کے حکم کے آگے سر جھکاتے ہوئے اپنی سب سے اعلیٰ اور سب سے قیمتی متاع اس کی راہ میں قربان کرنے کا جذبہ دل کے اندر ہونا چاہیے۔ اللہ تعالیٰ بہت رحیم ہے‘ اس نے بہت آسانیاں کی ہیں۔ وہ تم سے کوئی بڑی قربانی نہیں مانگتا‘ صرف ایک بات کا تقاضا ہے کہ اس کی بندگی میں ہر شے کو تج دینے کے لیے تیار رہو!

عبادات میں اللہ تعالیٰ کی جمالی صفات کا عکس

یہاں پر نفسیات سے متعلق ایک دلچسپ بات بھی ہے۔ اللہ تعالیٰ کی بہت سی شانیں ہیں اور اُس کی شانوں کا علم ہمیں اُس کے صفاتی ناموں سے ہوتا ہے۔ وہ احکم الحاکمین ہے‘ وہ العزیز ہے‘ وہ ذوانتقام ہے‘ وہ العدل ہے‘ مقتدرِ اعلیٰ ہے۔ یہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی جلالی صفات ہیں۔ ایک بندۂ مؤمن کے دل میں اللہ تعالیٰ کی ان جلالی شانوں کا بھی ایک عکس قائم رہنا چاہیے اور اس کا اظہار اس کی حرکات وسکنات (gestures) سے ہونا چاہیے۔ اسی لیے حکم ہے: ﴿ وَقُوۡمُوۡا لِلّٰہِ قٰنِتِیۡنَ ﴿۲۳۸﴾ ﴾ (البقرۃ) کہ اللہ کے حضور نماز میں کھڑے ہو تو انتہائی ادب کے ساتھ‘ نیازمندی اور عاجزی کے ساتھ۔ کیوں؟ یہ اللہ کی جلالی صفات کا ایک تقاضا ہے۔ تمہارے اندر عاجزی ہو‘ فروتنی ہو۔

اس کے ساتھ ساتھ اللہ تعالیٰ کی کچھ صفات وہ بھی ہیں کہ جو جلالی نہیں بلکہ جمالی ہیں۔ اللہ محبّت کرنے والا ہے‘ وہ وَدُود ہے‘ وہ رحیم ہے‘ وہ رحمان ہے۔ جمالی صفات اصل میں محبوب اور محب کے درمیان محبّت پیدا کرتی ہیں۔ محبت میں شدّت اور عاشقی کا سا جذبہ پیدا ہوتا ہے۔

اللہ کی ان جمالی شانوں کا تقاضا یہ ہے کہ بندے کی عبادت میں وارفتگی اور دیوانہ پن پیدا ہو۔ دیوانے اور فرزانے بظاہر انسانوں کی طرح چلتے پھرتے نظر آتے ہیں لیکن حقیقت میں وہ اور ہی دنیا میں گم ہوتے ہیں۔ محبوب کا تصوّر ہر وقت' ہر آن اُن کے اوپر ایسا قائم اور مسلّط ہوتا ہے کہ انہیں اپنی بھی ہوش نہیں ہوتی۔

اللہ تعالیٰ کی جمالی صفات کا تقاضا یہ ہے کہ عبادات میں یہی وارفتگی پیدا ہو۔ یہ کیفیت روزے میں پیدا ہوتی ہے' اس لیے کہ یہ ایک ایسی عبادت ہے کہ جس کا خارج میں کسی کو نہیں پتا کہ اس شخص کا روزہ ہے کہ نہیں! انسان کے اندر جتنی زیادہ درماندگی کی کیفیت پیدا ہوگی اور ایک دیوانہ پن پیدا ہوگا اتنا ہی اس روزے کا اجر و ثواب زیادہ ہے۔ حدیث قدسی کے الفاظ یاد کر لیں: ((اَلصَّوْمُ لِیْ وَاَنَا اَجْزِیْ بِہٖ)) (متفق علیہ) ''روزہ خاص میرے لیے ہے اور میں خود ہی اس کی جزا دوں گا''۔ یعنی یہ کوئی حساب کتاب میں آنے والا معاملہ نہیں ہے۔

حج کی عبادت بھی اصلاً اللہ کی صفاتِ جمال ہی کا ایک مظہر ہے۔ یہ امر پسندیدہ نہیں ہے کہ بندہ حج کے دوران بھی رکھ رکھاؤ کے ساتھ رہے۔ احرام بڑی اعلیٰ قسم کا ہو' رہائش بھی فائیو سٹار ہو۔ ٹیپ ٹاپ' رکھ رکھاؤ' صفائی ستھرائی یہ سب مطلوب نہیں ہے۔ انسان وہاں پر جتنا درماندہ اور عاجز ہو جائے اتنا ہی وہ اللہ کو پسند ہے' اس لیے کہ یہ صفاتِ جمال ہی کا ایک عکس ہے۔ جو پہناوا پہنا ہوا ہے وہ بھی کوئی باقاعدہ کپڑے تو نہیں ہیں' محض دو اَن سلی چادریں ہیں جو کچھ ہی دیر میں میلی کچیلی ہو جاتی ہیں۔ جب تک ناپاک نہ ہو جائیں' کوئی حرج نہیں ہے' بلکہ یہی تمہارا حسن ہے۔ سفر کر کے لٹے پٹے انداز میں وہاں پہنچیں تو یہ نہیں ہے کہ اب کچھ ریلیکس کرنا ہے' بلکہ جاتے ہی بیت اللہ شریف کا طواف کیا جائے' وہ بھی ایسے جیسے پروانے شمع کا طواف کر رہے ہیں۔ پھر عمرے کے بعد بھی آرام نہیں' بلکہ اب حج کے لیے نکلنا ہے۔ آبادی سے نکل کر صحرا میں پہنچ جاؤ۔ نیچے کوئی نرم گدیلے نہیں بلکہ نوکیلے پتھر ہیں۔ یومِ عرفہ میں اللہ ربّ العزت کو چیخ چیخ کر پکار رہے ہیں۔ یہ کیفیات ہیں کہ جو حج کی عبادت میں ہیں۔

قربانی اور فلسفۂ قربانی

پھر قربانی کے حوالے سے یہ ذہن میں رہنا چاہیے کہ اگر اللہ کے لیے اپنی خواہشات کو تج دینے کو تیار نہیں ہو تو کس منہ سے جانور ذبح کر رہے ہو! اگر اللہ کے احکام پر چلنے کے لیے تم ذرا

بھی اپنے اندر عزم وارادہ یا آمادگی پیدا نہیں کر رہے تو پھر کس بات کا دعویٰ کر رہے ہو! کہتے ہو کہ ہم ابراہیم علیہ السلام کے ماننے والے ہیں' لیکن ابراہیم علیہ السلام کا اُسوہ تو کچھ اور ہے۔ صرف غلط خواہشات کو ہی چھوڑنا نہیں ہے بلکہ اپنی محبوب ترین متاع کو اللہ کی راہ میں قربان بھی کرنا ہے۔ اس اعتبار سے قربانی کے معاملے کو کوئی ہلکی شے نہ سمجھا جائے۔ اس کی اصل سپرٹ کے مطابق قربانی کریں۔ اگر ایسا نہیں ہے تو پھر یہ محض ایک رسم بن گئی' بقول اقبال:

نماز و روزہ و قربانی و حج
یہ سب باقی ہیں' تُو باقی نہیں ہے!

اگر یہ سپرٹ نہیں ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ ہم نے اس حقیقت کو سمجھا ہی نہیں۔ اللہ کے لیے تھوڑا سا وقت نکالنا' عبادات کے لیے وقت نکالنا' دین کی دعوت کے لیے وقت نکالنا' کم سے کم تقاضا ہے۔ اگر ہم اس تقاضے کو بھی پورا نہیں کر رہے تو پھر کس منہ سے اللہ کا نام لے رہے ہیں! آج کل جانوروں کے حوالے سے خودنمائی' ستائش' ریاکاری کے مظاہر عام نظر آتے ہیں اور یہ وبا پھیل رہی ہے۔ دیکھ کر دل بیٹھتا ہے کہ کیا اس مقصد کے لیے اللہ نے قربانی کا کہا ہے؟ اتنے کروڑ کا جانور آ گیا' اتنے لاکھ کا' اتنی قیمت کا جانور آ گیا۔ (معاذ اللہ!) غور کرنا چاہیے کہ اس حوالے سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا اُسوہ کیا ہے؟ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا حکم کیا ہے؟

قربانی کے بارے میں ایک بات عرض کر دوں کہ اس کے دو پہلو اور مظاہر ہیں۔ ایک وہ ہے جسے ہم سُنّتِ ابراہیمی کہتے ہیں۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے جس طریقے سے قربانی کے لیے اپنے آپ کو اللہ کے حوالے کر دیا' اس سپرٹ کو قائم رکھنا۔ اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے پوری دنیا کے مسلمانوں کے لیے انہی دنوں میں اس کو عمومی طور پر جاری کر دیا۔ قربانی کا دوسرا پہلو اور مظہر وہ ہے جو حجاج کرام ادا کر رہے ہیں۔ یہ قربانی اپنی نوعیت کے اعتبار سے قدرے مختلف ہے۔ یہ دمِ تمتع ہے۔ سُنّتِ ابراہیمی والی قربانی وہ ہے جو ایک غیر مسافر اپنے گھر میں رہتے ہوئے اپنے پیسے سے ایک جانور خرید کر اللہ کی راہ میں قربان کرتا ہے۔ البتہ یہ قربانی مسافر پر واجب نہیں ہے۔ ویسے اس میں بھی اختلاف ہے کہ یہ واجب ہے یا سُنّتِ مؤکدہ ہے۔ احناف کے نزدیک صاحبِ استطاعت پر واجب ہے۔ جبکہ حجاج کرام کی قربانی دمِ تمتع ہے' وہ اس بات کا شکرانہ ہے کہ اللہ نے ہمیں ایک ہی سفر میں عمرہ اور حج جمع کرنے کی اجازت دی اور ہمیں اس کی توفیق

بخشی۔ اسی لیے جو آدمی سُنّتِ ابراہیمی یعنی عیدالاضحیٰ والی قربانی کرنا چاہتا ہے وہ پیچھے اپنے گھر والوں کو کہہ سکتا ہے کہ میری طرف سے قربانی کر دینا' اس لیے کہ وہاں جو میں کر رہا ہوں وہ دمِ تمتّع ہے۔ چاہے تو وہیں پر بھی کر سکتا ہے' لیکن چونکہ وہ مسافر ہے اس لیے اس پر وہ وجوب اس درجے کا نہیں ہے۔ تو یہ فرق ذہن میں رکھیے۔

حج اور قربانی کی فضیلت: احادیث کی روشنی میں

اب حج اور قربانی کے حوالے سے چند احادیث سنا کر اپنی بات ختم کرتا ہوں۔

(۱) عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رَضِىَ اللّٰہُ عَنْہُ ، قَالَ : سَمِعْتُ النَّبِيَّ ﷺ يَقُوْلُ : ((مَنْ حَجَّ لِلّٰهِ فَلَمْ يَرْفُثْ وَلَمْ يَفْسُقْ رَجَعَ كَيَوْمِ وَلَدَتْهُ أُمُّهُ)) (رَوَاهُ الْبُخَارِي)

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ انہوں نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو فرماتے ہوئے سنا: ''جو کوئی رضائے الٰہی کے لیے حج کرے کہ جس میں نہ کوئی بیہودہ بات ہو اور نہ کسی گناہ کا ارتکاب' تو وہ ایسے لوٹے گا جیسے اُس کی ماں نے اُسے ابھی جنا ہو۔''

(۲) عَنْ عَلِيٍّ رَضِىَ اللّٰہُ عَنْہُ ، قَالَ قَالَ رَسُولُ اللّٰهِ ﷺ : ((مَنْ مَلَكَ زَادًا وَرَاحِلَةً تُبَلِّغُهُ إِلَى بَيْتِ اللّٰهِ وَلَمْ يَحُجَّ فَلَا عَلَيْهِ أَنْ يَمُوتَ يَهُودِيًّا أَوْ نَصْرَانِيًّا، وَذٰلِكَ أَنَّ اللّٰهَ يَقُولُ فِي كِتَابِهِ : ﴿وَلِلّٰهِ عَلَى النَّاسِ حِجُّ الْبَيْتِ مَنِ اسْتَطَاعَ اِلَيْهِ سَبِيْلًا﴾ (رواہ الترمذی)

حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''جس شخص کی ملکیت میں زادِ راہ بھی ہو اور سواری بھی ہو جو اُسے بیت اللہ شریف تک پہنچا سکتی ہو' اور وہ حج نہیں کرتا' تو پھر اس بات سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ وہ یہودی ہو کر مرے یا نصرانی ہو کر مرے۔ اس لیے کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ''اور اللہ کا حق ہے لوگوں پر کہ وہ حج کریں اُس کے گھر کا' جو بھی استطاعت رکھتا ہو اس کے سفر کی۔''

آیت کا اگلا حصہ اس طرح ہے: ﴿وَمَنْ كَفَرَ فَاِنَّ اللّٰهَ غَنِيٌّ عَنِ الْعٰلَمِيْنَ ﴿٩٧﴾﴾ ''اور جس نے کفر کیا تو (وہ جان لے کہ) اللہ بے نیاز ہے تمام جہان والوں سے''—— گویا جس نے حج نہ کیا وہ مرتکبِ کفر ہے۔ ٹیکنیکلی ایسے شخص کے اوپر کفر کا اطلاق ہو یا نہ ہو' حقیقتاً یہ کفر ہی ہے۔ اُس لیے کہ اس نے اس کے بغیر ساری زندگی بسر کر دی اور پھر مر گیا۔

(۳) عَنْ أَبِي أُمَامَةَ رَضِیَ اللّٰہُ عَنْہُ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: ((مَنْ لَمْ يَمْنَعْهُ مِنَ الْحَجِّ حَاجَةٌ ظَاهِرَةٌ أَوْ سُلْطَانٌ جَائِرٌ أَوْ مَرَضٌ حَابِسٌ، فَمَاتَ وَلَمْ يَحُجَّ، فَلْيَمُتْ إِنْ شَآءَ يَهُوْدِيًّا وَإِنْ شَآءَ نَصْرَانِيًّا)) (رَوَاهُ الدَّارِمِيُّ)

حضرت ابواُمامہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے فرمایا: ’’جس شخص کو فریضہ حج کی ادائیگی سے کوئی ظاہری ضرورت یا کوئی ظالم بادشاہ یا مہلک مرض نہ روکے اور وہ پھر (بھی) حج نہ کرے اور (فریضہ حج کی ادائیگی کے بغیر) مرجائے تو چاہے وہ یہودی ہو کر مرے یا عیسائی ہو کر (اللہ تعالیٰ کو اس کی کوئی پرواہ نہیں ہے)۔‘‘

وَفِي رِوَايَةٍ عَنِ الْحَسَنِ قَالَ: قَالَ عُمَرُ بْنُ الْخَطَّابِ رَضِیَ اللّٰہُ عَنْہُ: لَقَدْ هَمَمْتُ أَنْ أَبْعَثَ رِجَالًا إِلٰى هٰذِهِ الْأَمْصَارِ فَيَنْظُرُوا كُلَّ مَنْ كَانَ لَهُ جِدَةٌ وَلَمْ يَحُجَّ فَيَضْرِبُوا عَلَيْهِمُ الْجِزْيَةَ۔ مَا هُمْ بِمُسْلِمِينَ! مَا هُمْ بِمُسْلِمِينَ! (رَوَاهُ السُّيُوْطِيُّ وَابْنُ كَثِيْرٍ)

ایک اور روایت میں حضرت حسن بصریؒ بیان کرتے ہیں کہ حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ’’بے شک میں نے ارادہ کیا کہ ان شہروں کی طرف کارندے بھیجوں اور وہ دیکھیں کہ ہر وہ شخص جو صاحبِ جائیداد ہے اور اُس نے حج نہیں کیا تو وہ اس پر جزیہ لگائیں (کیونکہ جو لوگ استطاعت کے باوجود حج نہ کریں) وہ مسلمان نہیں ہیں! وہ مسلمان نہیں ہیں!‘‘

(۴) عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رَضِیَ اللّٰہُ عَنْہُ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: ((اَلْعُمْرَةُ إِلَى الْعُمْرَةِ كَفَّارَةٌ لِمَا بَيْنَهُمَا، وَالْحَجُّ الْمَبْرُوْرُ لَيْسَ لَهُ جَزَاءٌ إِلَّا الْجَنَّةُ))(مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ)

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے فرمایا: ’’ایک عمرہ سے دوسرا عمرہ اپنے درمیان گناہوں کا کفّارہ ہیں اور حج مبرور کا بدلہ جنّت کے سوا اور کچھ نہیں ہے (یعنی ایسے حج والا شخص جنّت میں جائے گا)۔‘‘

(۵) عَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ مَسْعُوْدٍ رَضِیَ اللّٰہُ عَنْہُ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: ((تَابِعُوا بَيْنَ الْحَجِّ وَالْعُمْرَةِ، فَإِنَّهُمَا يَنْفِيَانِ الْفَقْرَ وَالذُّنُوبَ، كَمَا يَنْفِي الْكِيرُ خَبَثَ الْحَدِيدِ وَالذَّهَبِ وَالْفِضَّةِ، وَلَيْسَ لِلْحَجَّةِ الْمَبْرُوْرَةِ ثَوَابٌ إِلَّا

الْجَنَّةُ)) (رَوَاهُ التِّرْمِذِيُّ وَالنَّسَائِيُّ وَالطَّبَرَانِيُّ)

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ’’حج اور عمرہ یکے بعد دیگرے کرتے رہو‘ کیونکہ یہ دونوں محتاجی اور گناہ کو اس طرح دور کرتے ہیں جس طرح بھٹی لوہے‘ سونے اور چاندی کے میل کچیل دور کرتی ہے۔ اور حج مقبول کا ثواب صرف جنّت ہی ہے۔‘‘

(٦) عَنْ عَائِشَةَ أُمِّ الْمُؤْمِنِينَ رضی اللہ عنہا قَالَتْ: اسْتَأْذَنْتُ النَّبِيَّ ﷺ فِي الْجِهَادِ، فَقَالَ: ((جِهَادُكُنَّ الْحَجُّ)) وَقَالَ عَبْدُ اللهِ الْوَلِيدِ: حَدَّثَنَا سُفْيَانُ عَنْ مُعَاوِيَةَ بِهٰذَا. (رَوَاهُ الْبُخَارِيُّ وَأَحْمَدُ)

اُمّ المومنین حضرت عائشہ صِدّیقہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ انہوں نے حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے جہاد کی اجازت طلب کی تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ’’تمہارا (عورتوں کا) جہاد حج ہے۔‘‘ عبداللہ بن الولید نے کہا: ہمیں سفیان نے حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ سے اس طرح روایت کیا ہے۔

(٧) عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ رضی اللہ عنہما عَنِ الْفَضْلِ أَوْ أَحَدِهِمَا عَنِ الْآخَرِ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللهِ ﷺ: ((مَنْ أَرَادَ الْحَجَّ فَلْيَتَعَجَّلْ، فَإِنَّهُ قَدْ يَمْرَضُ الْمَرِيضُ، وَتَضِلُّ الضَّالَّةُ وَتَعْرِضُ الْحَاجَةُ)) (رَوَاهُ أَحْمَدُ وَابْنُ مَاجَه)

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما اپنے بھائی حضرت فضل بن عباس رضی اللہ عنہما سے یا وہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ’’جس کا حج کا ارادہ ہو تو وہ جلدی کرے کہ کبھی کوئی بیمار پڑ جاتا ہے یا کوئی چیز گم ہو جاتی ہے یا کوئی اور ضرورت پیش آ جاتی ہے۔‘‘

(٨) عَنْ أُمِّ مَعْقِلٍ رضی اللہ عنہا عَنِ النَّبِيِّ ﷺ قَالَ: ((عُمْرَةٌ فِي رَمَضَانَ تَعْدِلُ حَجَّةً)) (رَوَاهُ أَحْمَدُ وَالتِّرْمِذِيُّ وَاللَّفْظُ لَهُ)

حضرت اُمّ معقل رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ’’رمضان میں عمرہ کرنے کا ثواب حج کے برابر ہے۔‘‘

(٩) عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ رضی اللہ عنہما: أَنَّ امْرَأَةً مِنْ جُهَيْنَةَ، جَاءَتْ إِلَى النَّبِيِّ ﷺ

فَقَالَتْ: إِنَّ أُمِّي نَذَرَتْ أَنْ تَحُجَّ، فَلَمْ تَحُجَّ حَتّٰى مَاتَتْ. أَفَأَحُجُّ عَنْهَا؟ قَالَ: ((نَعَمْ، حُجِّي عَنْهَا، أَرَأَيْتِ لَوْ كَانَ عَلَى أُمِّكِ دَيْنٌ أَكُنْتِ قَاضِيَتَهُ؟ اقْضُوا اللّٰهَ ، فَاللّٰهُ أَحَقُّ بِالْوَفَاءِ)) (رَوَاهُ الْبُخَارِيُّ)

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ قبیلہ جُہینہ کی ایک عورت نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بارگاہِ اقدس میں حاضر ہوکر عرض گزار ہوئی: میری والدہ نے حج کرنے کی منّت مانی تھی لیکن وہ حج نہ کرسکیں یہاں تک کہ فوت ہوگئیں۔ کیا میں ان کی طرف سے حج کروں؟ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ”ہاں تم ان کی طرف سے حج کرو۔ اگر تمہاری والدہ پر قرض ہوتا تو کیا تم اُسے ادا کرتیں؟ لہٰذا اللہ تعالیٰ زیادہ حقدار ہے کہ اُس کا قرض ادا کیا جائے۔“

(۱۰) عن أبي هُرَيْرَة رَضِیَ اللّٰہُ عَنْہُ قال: قال رَسولُ اللّٰهِ صلی اللہ علیہ وسلم: ((مَنْ وَجَدَ سَعَةً فَلَم يُضَحِّ، فَلَا يَقْرَبَنَّ مُصَلَّانا)) (أخرجه الإمام أحمد وابن ماجه)

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ”جو شخص صاحبِ حیثیت ہو پھر بھی وہ قربانی نہ کرے‘ تو وہ ہماری عیدگاہ کے قریب بھی نہ آئے۔“

(۱۱) وعنْ عائِشةَ رضی اللہ عنہا أَنَّ النَّبِيَّ صلی اللہ علیہ وسلم قال: ((مَا عَمِلَ ابْنُ آدَمَ يَوْمَ النَّحْرِ عَمَلًا أَحَبَّ إِلَى اللّٰهِ - عَزَّ وجَلَّ - مِنْ هِراقَةِ دَمٍ، وإِنَّهُ لَيأْتِي يَوْمَ القِيامَةِ بِقُرُونِها وأَظْلافِها وأَشْعارِها، وإِنَّ الدَّمَ لَيَقَعُ مِن اللّٰهِ - عَزَّ وجلَّ - بِمَكانٍ قَبْلَ أَنْ يَقَعَ على الأَرْضِ، فَطِيبُوا بِها نَفْسًا)) (رواه الترمذي وابن ماجه)

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ”اِبن آدم (اِنسان) نے قربانی کے دِن کوئی ایسا عمل نہیں کیا جو اللہ کے نزدیک خون بہانے (یعنی قربانی کرنے) سے زیادہ پسندیدہ ہو۔ اور قیامت کے دن وہ (ذبح کیا ہوا جانور) اپنے سینگوں، بالوں اور کھروں کے ساتھ آئے گا۔ اور قربانی کا خون زمین پر گرنے سے پہلے اللہ تعالیٰ کے ہاں قبول ہوجاتا ہے‘ لہٰذا تم اس کی وجہ سے (قربانی کرکے) اپنے دِلوں کو خوش کرو۔“

بار بار حج وعمرہ کرنا

ان روایات سے واضح ہوتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے صاحبِ استطاعت حضرات کو

حکم دیا کہ وہ حج اور عمرہ بار بار کیا کریں۔ رسول اللہ ﷺ نے جیسی سعی پیہم والی زندگی بسر کی ہے اس میں آپ ﷺ کے لیے بار بار حج کرنے کے مواقع نہیں تھے‘ البتہ متعدد عمرے کیے ہیں۔ روایات میں چار عمروں کا تذکرہ آتا ہے لیکن حج صرف ایک ہی کر سکے‘ حجۃ الوداع‘ جو سیرتِ طیبہ کا سب سے معروف واقعہ ہے۔ ہمیں چاہیے کہ ہم اس حج کی تمام روداد بار بار پڑھیں‘ ان دنوں کے اندر خاص طور سے پڑھیں۔ یہ بڑی تفصیلی روایات ہیں۔ اس حج کے دوران آپ ﷺ کے جو خطبات ہیں‘ ان کا مطالعہ کریں‘ اس لیے کہ وہ دین کی تعلیمات کا خلاصہ اور نچوڑ ہیں۔ اس کے بعد کوئی نیا حکم نہیں آیا۔ اس کے اندر تمام احکام کے concluding ریمارکس ہیں۔

رسول اللہ ﷺ نے عمرہ کی فضیلت بیان کرتے ہوئے فرمایا کہ عمرے سے عمرے تک جو دورانیہ ہے‘ یعنی ایک آدمی نے عمرہ کیا اس کے بعد دوسرا عمرہ کیا تو یہ اس دوران اس کے اعمال کے کفارے کا ذریعہ بن جاتے ہیں۔ یہ بھی کہا گیا کہ بار بار کرو‘ جتنا زیادہ کر سکتے ہو وہ کرو۔ بعض دفعہ یہ خیال آتا ہے کہ اس میں کافی خرچ ہوتا ہے۔ ایک دفعہ کر لیا‘ دوبارہ جائیں گے تو پھر بہت خرچ ہوگا تو یہ رقم کسی ضرورت مند کو دے دی جائے۔ عام طور پر اس قسم کی تاویلات وہی لوگ اختیار کرتے ہیں جو نہ وہ کرنا چاہتے ہیں اور نہ یہ کرنا چاہتے ہیں۔ صرف باتیں بناتے رہے۔ حج بھی نہیں کیا‘ عمرہ بھی نہیں کیا اور مال کے اوپر سانپ بھی بن کر بیٹھے رہے۔ جو لوگ عمرہ اور حج بار بار کرتے ہیں وہ دوسرے معاملات میں بھی خرچ کرنے سے پیچھے نہیں رہتے۔ پھر اسے رزق کی کشادگی کا ذریعہ بھی بتایا گیا۔ بظاہر مال کم ہو رہا ہے لیکن وہ مال کی کمی اس کے اوپر کبھی اثر انداز نہیں ہوتی۔

عشرۂ ذوالحجہ کے لیے تیاری

اس ضمن میں اب جو عشرۂ ذوالحجہ آنے والا ہے‘ اس کی تیاری کرنا ہمارے لیے بہت ضروری ہے۔ رمضان المبارک میں تو یہ ہوتا ہے کہ آخری عشرے کے لیے ایک ماحول بن جاتا ہے۔ سحری اور افطاری کی سرگرمیاں ہوتی ہیں۔ پھر رات کو تراویح کا معاملہ ہوتا ہے۔ بدقسمتی سے عشرۂ ذوالحجہ جو انتہائی فضیلت کا حامل ہے‘ اس کے لیے ماحول ہی نہیں بنتا سوائے ان لوگوں کے جو حج کا سفر کرنے والے ہیں۔ باقی لوگوں کو تو پتا ہی نہیں چلتا کہ کب شروع ہوا اور کب ختم ہو گیا۔ جبکہ اس کی بہت اہمیت ہے۔ ان ایام میں روزہ رکھنے کی بہت ہی فضیلت بیان ہوئی ہے۔

آغاز میں مَیں نے جو آیات پڑھی ہیں:

﴿وَالۡفَجۡرِ ۝۱ وَلَیَالٍ عَشۡرٍ ۝۲﴾

’’قسم ہے فجر کے وقت کی۔ اور دس راتوں کی۔‘‘

جمہور مفسرین کی رائے یہ ہے کہ لَیَالٍ عَشۡرٍ سے مراد ذوالحجہ کی دس راتیں ہیں۔ اہل تفسیر کے ہاں اس پر اختلاف ہے کہ رمضان المبارک کا آخری عشرہ زیادہ فضیلت کا حامل ہے یا عشرہ ذوالحجہ! راجح قول یہ ہے کہ راتیں رمضان المبارک کی زیادہ فضیلت کی حامل ہیں کہ ان میں لیلۃ القدر ہے جبکہ دن عشرہ ذوالحجہ کے زیادہ فضیلت والے ہیں۔ چنانچہ اس میں کیے ہوئے نیک اعمال اجر و ثواب کے اعتبار سے نہایت عظیم اور وقیع ہیں۔

یہ بات بھی ذہن میں رہے کہ اگر ان ایام میں کوئی عبادت یا عمل صالح اجر و ثواب کے حوالے سے زیادہ اہمیت کا حامل ہے تو انہی ایام میں معصیت کرنے پر پکڑ بھی زیادہ ہے۔ چنانچہ ان اوقات کو قیمتی بنانا اور ان سے زیادہ سے زیادہ فائدہ حاصل کرنا چاہیے۔ تلبیہ ہے‘ ذکر اللہ ہے‘ نماز ہے‘ روزہ ہے۔ سوائے یومِ نحر کے باقی نو دن کا روزہ بہت فضیلت کا حامل ہے۔ غیر حاجیوں کے لیے یوم عرفہ کا روزہ انتہائی فضیلت کا حامل ہے۔ حدیث میں آتا ہے کہ پچھلا سال پورا اور اگلا سال پورا ان کی معافی کا اعلان ہو جاتا ہے۔ حجاج کے لیے یومِ عرفہ کا روزہ نہ رکھنا زیادہ افضل ہے‘ جبکہ جو لوگ اپنے اپنے گھروں میں ہیں ان کے لیے یومِ عرفہ کا روزہ رکھنا انتہائی فضیلت کا حامل ہے۔ ان فضائل سے محروم رہنا اور ان کی طرف توجہ اور التفات نہ کرنا بڑی محرومی کی بات ہے۔

اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ ہمیں ان حقائق کو سمجھنے‘ ان سے صحیح نتائج اخذ کرنے اور پھر ان کے مطابق اپنی زندگی کو استوار کرنے اور عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے!

اقول قولی ھذا واستغفر اللہ لی ولکم ولسائر المسلمین والمسلمات

❁ ❁ ❁

قرآن حکیم کی مقدس آیات اور احادیث نبویؐ آپ کی دینی معلومات میں اضافے اور دعوت و تبلیغ کے لیے شائع کی جاتی ہیں۔ ان کا احترام آپ پر فرض ہے۔ لہٰذا جن صفحات پر یہ آیات درج ہیں ان کو صحیح اسلامی طریقے کے مطابق بے حرمتی سے محفوظ رکھیں۔

معذور افراد کے حقوق

احمد علی محمودی

مذاہبِ عالَم کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ اُن کی تعلیمات میں سائلین‘ محرومین‘ مستضعفین اور کسی بھی انداز کی معذوری اور محتاجی کے سدِّ باب کے اشارے اور واضح اسلوب موجود ہیں۔ قبل مسیحؑ کے دیگر مختلف افکار اور مذاہب کے راہنما اپنے اپنے صحائف اور فرمودات کے ذریعے معاشرے کے محروم اور ضرورت مند لوگوں کی بھلائی کے بارے میں مقتدر حضرات کو آگاہ کرتے رہے۔ بعد ازاں ان کی سرداری اپنے ہاتھ میں لے کر ظلم و جبر کا کاروبار عام کرنے والے کامیاب ہو گئے۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر نازل ہونے والی آسمانی کتب یعنی تورات اور انجیل میں اِن طبقات کی فلاح اور بھلائی کے ابواب موجود ہیں۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا اللہ کے اذن سے اندھوں کو بینائی بخشنا اور کوڑھ کے مریضوں کو شفایاب کرنا‘ اُن کی تعلیمات کا عملی نمونہ ہے۔ حتیٰ کہ یہ سلسلہ نبی آخر الزماں حضرت محمدؐ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی شریعتِ مطہرہ تک آن پہنچا اور اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں معذور افراد کے بارے میں واضح اور کھلے احکامات کا ذکر کرتے ہوئے‘ آنحضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زندگی میں ہی عملی اقدامات کا بندوبست فرمایا۔

تکریمِ انسانیت

ربِّ کائنات نے جتنی مخلوقات کو وجود بخشا‘ ان میں سب سے افضل اور مکرّم انسان کو بنایا ہے۔ ارشادِ ربانی ہے:

﴿لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِیْٓ اَحْسَنِ تَقْوِیْمٍ ۝۴﴾ (التین)

’’تحقیق ہم نے انسان کو بہترین ساخت پر پیدا کیا۔‘‘

ای میل: wad_hsp@yahoo.com

﴿وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِيْٓ اٰدَمَ ......﴾ (بنی اسرائیل: ۷۰)

’’اور (یہ تو ہماری عنایت ہے کہ) ہم نے بنی آدم کو بزرگی دی......‘‘

متذکرہ بالا آیاتِ مقدّسہ کے اسباق میں یہ امر واضح ہو رہا ہے کہ خالقِ کائنات نے نفسِ انسانی کو بہت عزّت و تکریم اور احترام و احتشام سے نوازا ہے۔

رنگ و نسل اور مذہب سے بالاتر

دینِ اسلام ہمیں انسانیت کی تکریم کا جو درس دیتا ہے وہ رنگ و نسل اور فرقہ و مذہب سے بہت بلند و بالا ہے۔ انسان کا احترام اُس کے رنگ‘ نسل‘ خاندان یا مذہب کے باعث نہیں بلکہ نوعِ انسان کے ایک فرد ہونے کے باعث ہے۔

نبی مکرم ﷺ کے خطبہ حجۃ الوداع میں انسانیت کو جو عزّت اور وقار عطا کیا گیا ہے وہ دنیا کا کوئی بھی دستور نہیں دے سکتا۔ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

’’اے بنی نوعِ انسان! تمہارے خون‘ تمہارے اموال اور تمہاری عزّتیں تم پر اِسی طرح حرام ہیں‘ جس طرح اِس ماہ (ذوالحجہ) اِس شہر (مکہ) میں تمہارے لیے اِس دن (یومِ عرفہ) کی عزّت ہے۔‘‘ (السیرۃ النبویہ‘ ابن ہشام)

رسول اللہ ﷺ نے انسانوں کی عزّت و آبرو‘ جان اور مال کو ایک دوسرے پر حرام قرار دیا ہے۔ گویا عزّت اور جان و مال کے سلسلے میں ساری انسانیت برابر ہے۔ آپ ﷺ کا ذاتی کردار تکریمِ انسانیت کی سب سے بڑی دلیل ہے۔ ایک مرتبہ آں حضور ﷺ کے سامنے سے ایک جنازہ گزرا تو آپ ﷺ کھڑے ہو گئے۔ صحابہؓ نے عرض کیا: یارسول اللہ ﷺ! یہ ایک یہودی کا جنازہ تھا۔ ارشاد فرمایا: ’’مَیں انسانی جان کے احترام میں کھڑا ہوا ہوں۔‘‘

تکریمِ انسانیت کی بلند ترین سطح یہ ہے کہ انسان دوسرے انسان کی دِل آزاری نہ کرے‘ اُس کا مذاق نہ اُڑائے‘ اُسے اس کے عیبوں کا طعنہ نہ دے‘ اُسے بُرے ناموں یا القاب سے نہ پکارے‘ اُسے اپنے سے کم تر یا گھٹیا محسوس نہ کرے۔ قرآن مجید میں اللہ ربّ العزت نے تکریمِ انسانیت کا درس دیتے ہوئے ارشاد فرمایا:

﴿یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا یَسْخَرْ قَوْمٌ مِّنْ قَوْمٍ عَسٰٓی اَنْ یَّکُوْنُوْا خَیْرًا مِّنْھُمْ وَلَا نِسَآءٌ مِّنْ نِّسَآءٍ عَسٰٓی اَنْ یَّکُنَّ خَیْرًا مِّنْھُنَّ ۚ وَلَا

﴿تَلۡمِزُوۡۤا اَنۡفُسَكُمۡ وَلَا تَنَابَزُوۡا بِالۡاَلۡقَابِ ؕ﴾ (الحجرات:۱۱)

’’اے لوگو جو ایمان لائے ہو! نہ مرد دوسرے مردوں کا مذاق اُڑائیں‘ ہوسکتا ہے کہ وہ ان سے بہتر ہوں‘ اور نہ عورتیں دوسری عورتوں کا مذاق اُڑائیں‘ ہوسکتا ہے کہ وہ ان سے بہتر ہوں۔ اور آپس میں ایک دوسرے پر طعن نہ کرو اور نہ ایک دوسرے کو بُرے القاب سے یاد کرو۔‘‘

دینِ اسلام نے زندگی کے معاملات میں ہر انسان کو بلاتمیزِ رنگ ونسل یا سماجی مرتبہ مساوی حیثیت عطا کی ہے۔ یہ عام سماجی رویّہ ہے کہ معذور افراد کو زندگی کے عام معاملات اور میل جول میں نظر انداز کرنے کی روش اختیار کی جاتی ہے۔ قرآنی تعلیمات نے اِس روش اور عادت کی سخت سے مذمّت کرتے ہوئے ہر انسان کو لائقِ عزّت و وقار قرار دیا ہے۔

معاشرتی رتبہ اور توجّہ کے مستحق

ایک موقع پر آں حضور ﷺ رؤساءِ مشرکین کو تبلیغ فرما رہے تھے کہ اتنے میں نابینا صحابی حضرت عبداللہ بن اُمّ مکتوم رضی اللہ عنہ آپؐ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ دوسروں سے مصروفِ گفتگو ہونے کی وجہ سے آپ ﷺ حضرت عبداللہ بن اُمّ مکتوم رضی اللہ عنہ کی طرف متوجّہ نہ ہوسکے تو اِس عدم توجہی پر یہ آیات نازل ہوئیں:

﴿عَبَسَ وَتَوَلّٰۤی ۙ﴿۱﴾ اَنۡ جَآءَہُ الۡاَعۡمٰی ؕ﴿۲﴾ وَمَا یُدۡرِیۡکَ لَعَلَّہٗ یَزَّکّٰۤی ۙ﴿۳﴾ اَوۡ یَذَّکَّرُ فَتَنۡفَعَہُ الذِّکۡرٰی ؕ﴿۴﴾﴾ (عبس)

’’تیوری چڑھائی اور مُنہ پھیر لیا۔ اس بات پر کہ وہ نابینا اُنؐ کے پاس آ گیا۔ آپ کو کیا خبر‘ شاید وہ سُدھر جائے۔ یا نصیحت پر دھیان دے اور نصیحت کرنا اس کے لیے نافع ہو!‘‘

اِن آیاتِ مبارکہ کے توسط سے اُمّت کو یہ تعلیم دی گئی ہے:

(۱) دیگر افرادِ معاشرہ کی نسبت معذور افراد زیادہ توجّہ کے مستحق ہیں۔ دوسرے افراد کو اِن پر ترجیح دیتے ہوئے انہیں نظر انداز نہ کیا جائے۔

(۲) عزّت و وقار کے مرتبے کا تعین سماجی یا معاشرتی حیثیت کو دیکھ کر نہ کیا جائے‘ بلکہ اس کے لیے ذاتی کردار‘ تقویٰ‘ اصلاح طلبی اور نیکی کے جذبے کو معیار بنایا جائے۔

(۳) معذور افراد کو تعلیم سے بہرہ مند کیا جائے‘ کیونکہ وہ دیگر انسانوں کی طرح مفید اور کارآمد ثابت ہوسکتے ہیں۔

دینِ اسلام نے کسی شخص کے جسمانی نقص یا کمزوری کی بنا پر اُس کی عزّت وتوقیر اور معاشرتی رُتبہ کو کم کرنے کی ہرگز اجازت نہیں دی' بلکہ جابجا ایسے واقعات اور احکامات موجود ہیں جن کی بنیاد پر اللہ اور اُس کے رسول ﷺ نے ایسے لوگوں کو دوسرے انسانوں کی نسبت زیادہ عزّت بخشی ہے۔

حضرت عبداللہ بن اُمّ مکتوم رضی اللہ عنہ نابینا تھے۔ وہ حضور ﷺ کی خدمت میں حاضر ہو کر اپنا کچھ مدّعا بیان کرنا چاہتے ہیں اور تعلیماتِ رسولؐ سے بہرہ مند ہونے کی خواہش رکھتے ہیں۔ بینائی نہ ہونے کی وجہ سے اُنھوں نے حاضر خدمت ہوتے ہی اپنا مدّعا بیان کرنا شروع کر دیا۔ عین اُسی وقت کچھ اشرافِ قریش بھی آپ ﷺ کے پاس بیٹھے تھے' جنھیں آپؐ دینِ حق کی تبلیغ فرما رہے تھے۔ دعوتِ حق کی حکمتِ عملی اور محویت کے باعث آپ ﷺ عبداللہ بن اُمِّ مکتوم رضی اللہ عنہ کی طرف توجّہ نہ دے سکے اور اُن کے سوالات کا جواب بھی نہ دیا' بلکہ ابن مکتوم رضی اللہ عنہ کی بار بار ندا اور مداخلت سے سرکارِ دوعالم ﷺ کو قدرے ناگواری ہوئی۔ اس موقع پر باری تعالیٰ نے اپنے حبیبِ مکرّم ﷺ کو متوجّہ فرماتے ہوئے سائل کی مخلصانہ طلب اور راہِ حق کی سچی جستجو کو زیادہ اہمیت دینے کی نشان دہی فرمائی۔

ایک اور واقعہ جو بڑی اہمیت کا حامل ہے کہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ لوگوں کو کھانا کھلا رہے تھے۔ آپؓ نے دیکھا کہ ایک شخص بائیں ہاتھ سے کھانا کھا رہا ہے۔ آپؓ نے فرمایا کہ اے بندۂ خدا! دائیں ہاتھ سے کھا۔ اُس نے جواب دیا کہ ''وہ مشغول ہے''۔ آپؓ آگے بڑھ گئے۔ جب دوبارہ گزرے تو پھر وہی فرمایا اور اُس شخص نے پھر وہی جواب دیا۔ جب تیسری بار آپؓ نے اُس کو ٹوکا تو اُس نے جواب دیا کہ ''موتہ کی لڑائی میں میرا دایاں ہاتھ کٹ گیا تھا۔'' یہ سن کر آپؓ رونے لگے اور پاس بیٹھ کر اُس سے پوچھنے لگے کہ تمہارے کپڑے کون دھوتا ہے اور تمہاری دیگر ضروریات کیسے پوری ہوتی ہیں؟ تفصیلات معلوم ہونے پر آپؓ نے اُس کے لیے ایک ملازم کا انتظام کیا' اسے ایک سواری دلوائی اور دیگر ضروریاتِ زندگی بھی مہیّا کیں۔ (کتاب الآثار از ابو یوسف ۱:۲۰۸ رقم ۹۲۷ھ)

اِس واقعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ حکومتِ اسلامیہ کا فرض ہے کہ وہ معذور افراد کی ضروریات کا خیال رکھنے میں کوتاہی اور سستی کی مرتکب نہ ہو۔

ایک پگلی عورت کا واقعہ بھی حدیث میں نقل ہوا ہے جسے متعدد محدثین مثلاً امام مسلم' ابوداوٗد'

قاضی عیاض، قسطلانی، ابویعلیٰ اور ذہبی (رحمہم اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین) نے حضرت اَنس رضی اللہ عنہ کی زبانی تحریر کیا ہے کہ مسجدِ نبویؐ میں آں حضور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے پاس بیٹھے کچھ اہم موضوعات پر گفتگو فرما رہے تھے کہ پھٹے پرانے کپڑوں میں ملبوس ایک بڑھیا مجمع کے آخر میں کھڑے ہو کر کچھ کہنا چاہ رہی تھی۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم اُس کی طرف متوجّہ ہوئے۔ اُس نے عرض کیا کہ حضورؐ! مَیں کچھ عرض کرنا چاہتی ہوں مگر سب کے سامنے نہیں۔ صحابہ کرامؓ نے عرض کیا: یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم! ’’یہ عورت پاگل ہے اور ایسے ہی آپؐ کا وقت ضائع کرے گی‘‘۔ آپؐ کا چہرۂ اَقدس متغیّر ہوا، فرمایا: ’’پاگل ہے تو کیا انسان نہیں؟ کیا اِس کی خواہشات اور تمنّائیں نہیں ہیں؟ یہ کچھ کہنے آئی ہے‘‘۔ لہٰذا آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم مسجدِ نبوی سے نکل کر اُس کے ساتھ چل پڑے۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے اُس سے اُس کی ضرورت پوچھی اور ساتھ ہی فرمایا کہ تیری ہر بات تسلیم کی جائے گی۔ بڑھیا آگے آگے چلتی رہی اور سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم اُس کے پیچھے پیچھے چلتے رہے۔ مدینہ کی ایک گلی کی نکڑ پر بڑھیا نے آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم سے کہا کہ آپؐ زمین پر تشریف رکھیں۔ آپؐ بیٹھ گئے۔ بڑھیا نے اپنی پوری داستان سنائی اور رحمۃ للعالمین صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے اُس کی ساری ضروریات پوری کر دیں۔

درج بالا واقعات سے معلوم ہوتا ہے کہ بے سہاروں کو سہارا دینا، ان کی باتوں کو توجّہ سے سننا اور ان کی مدد کرنا بھی ایک بڑی عبادت ہے۔

اہلِ قرابت نان ونفقہ کے حق دار

اسلام نے جہاں خصوصی افراد کو معاشرے میں عدم توجہی سے محفوظ رکھنے کے احکامات جاری کیے، وہاں اُن کے سماجی تحفظ کا بھی اہتمام کیا ہے۔ قدرت نے جہاں انہیں کسی ایک صفت سے محروم کیا وہیں اُن کی معاونت اور مدد کے لیے ان کے حقوق کا حکم بھی صادر کیا ہے۔ مثلاً سورۃ النور میں فرمایا:

﴿لَیۡسَ عَلَی الۡاَعۡمٰی حَرَجٌ وَّ لَا عَلَی الۡاَعۡرَجِ حَرَجٌ وَّ لَا عَلَی الۡمَرِیۡضِ حَرَجٌ وَّ لَا عَلٰۤی اَنۡفُسِکُمۡ اَنۡ تَاۡکُلُوۡا مِنۡۢ بُیُوۡتِکُمۡ اَوۡ بُیُوۡتِ اٰبَآئِکُمۡ اَوۡ بُیُوۡتِ اُمَّہٰتِکُمۡ اَوۡ بُیُوۡتِ اِخۡوَانِکُمۡ اَوۡ بُیُوۡتِ اَخَوٰتِکُمۡ اَوۡ بُیُوۡتِ اَعۡمَامِکُمۡ اَوۡ بُیُوۡتِ عَمّٰتِکُمۡ اَوۡ بُیُوۡتِ اَخۡوَالِکُمۡ اَوۡ بُیُوۡتِ

خٰلٰتِکُمۡ اَوۡ مَا مَلَکۡتُمۡ مَّفَاتِحَہٗۤ اَوۡ صَدِیۡقِکُمۡ ؕ لَیۡسَ عَلَیۡکُمۡ جُنَاحٌ اَنۡ تَاۡکُلُوۡا جَمِیۡعًا اَوۡ اَشۡتَاتًا ؕ﴾ (النور : ٦١)

’’کوئی حرج نہیں اگر کوئی اندھا‘ یا لنگڑا‘ یا مریض (کسی کے گھر سے کھالے) اور نہ تمہارے اُوپر اس میں کوئی مضائقہ ہے کہ اپنے گھروں سے کھاؤ یا اپنے باپ دادا کے گھروں سے‘ یا اپنی ماؤں کے گھروں سے‘ یا اپنے بھائیوں کے گھروں سے‘ یا اپنی بہنوں کے گھروں سے‘ یا اپنے چچاؤں کے گھروں سے‘ یا اپنی پھوپھیوں کے گھروں سے‘ یا اپنے ماموؤں کے گھروں سے‘ یا اپنی خالاؤں کے گھروں سے‘ یا اُن گھروں سے جن کی کنجیاں تمہاری سپردگی میں ہوں‘ یا اپنے دوستوں کے گھروں سے۔ اس میں بھی کوئی حرج نہیں کہ تم لوگ مل کر کھاؤ یا الگ الگ۔‘‘

یہاں بے بصر اور جسمانی طور پر معذور افراد کے لیے ایک نعمت اور عطیۂ خداوندی کا اعلان کرتے ہوئے اُنھیں فاقہ کشی اور بھوک ونگ سے محفوظ کر دیا گیا کہ اہلِ قرابت اُن کی ضروریات اور حقوق سے جان چھڑاتے نہ پھریں اور نہ خصوصی افراد اپنی بے بسی اور اپنوں کی بے مروّتی کے باعث خودکشیاں کرتے پھریں۔ دیکھیے کتنے عظیم اور بنیادی چارٹر کا اعلان ہے:

۱) نابینا‘ بیمار اور جسمانی طور پر معذور (اپاہج) افراد چونکہ جنگ میں شریک نہیں ہو سکتے تھے‘ لہٰذا اُنھیں قریبی رشتہ داروں کے گھروں سے کھانا کھانے کی اجازت دی گئی۔

۲) قریش اور سردارانِ مکہ معذور افراد کو منحوس اور قابلِ نفرت خیال کرتے تھے۔ لہٰذا اللہ تعالیٰ نے اُن کی تکریم کرتے ہوئے‘ اُن کے حقوق اور عزّتِ نفس کا اعلان کیا اور جاہلانہ رسوم کا قلع قمع کر دیا۔

۳) ماں باپ اور بہن بھائی معذور افراد کو کراہتاً رشتہ داروں کے گھر چھوڑ آتے تھے تاکہ وہ خود تو خوب سیر ہو کر کھالیں اور یہ کہیں سے روکھی سوکھی کھالیں۔ ربّ العزت کو یہ بات پسند نہ تھی‘ لہٰذا ترغیباً والدین اور بہن بھائیوں یا قریبی رشتہ داروں کے گھر سے کھانے کی اجازت دی۔

۴) بہن بھائیوں‘ چچاؤں‘ پھوپھیوں‘ ماموؤں اور خالاؤں کے گھروں سے‘ بلکہ اُن کی عدم موجودگی میں بھی اُن کے ہاں کھانا کھانے کی اجازت اور رخصت دی گئی۔

۵) رشتہ داروں کے بعد جن گھروں کی کنجیاں اُن کے حوالے کی گئیں‘ وہاں سے بھی کھانے کی

اجازت دی گئی۔ دوست احباب کے گھر کو بھی رشتہ داروں کے گھروں سے تشبیہ دی گئی تاکہ یہ قربت بھی عظمت کی علامت رہے اور خصوصی افراد کے حقوق یہاں بھی محفوظ رہیں۔

٦) بعض لوگ معذور لوگوں کو حقیر سمجھ کر الگ تھلگ بٹھا کر کھانا دیتے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے تنہا خوری کی کراہت کو ختم کرتے ہوئے اپنے رسول ﷺ کے ذریعے اکٹھے کھانے کی ترغیب دی۔

حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کا گزر کسی کے دروازے پر سے ہوا جہاں ایک سائل بھیک مانگ رہا تھا۔ وہ ایک بوڑھا آدمی تھا جس کی بصارت زائل ہو چکی تھی۔ آپؓ نے پوچھا: تم اہلِ کتاب کے کس گروہ سے ہو؟ اُس نے کہا: یہودی۔ آپؓ نے اس سے پوچھا: تمہیں کس چیز نے بھیک مانگنے پر مجبور کیا ہے؟ اُس نے جواب دیا: مَیں بڑھاپے‘ ضرورت مندی اور جزیہ کی وجہ سے بھیک مانگ رہا ہوں۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ اُس کا ہاتھ پکڑ کر اپنے گھر لے گئے اور گھر میں سے اُسے کچھ لا کر دیا اور پھر آپؓ نے بیت المال کے نگران کو بلایا اور فرمایا: اِس کا اور اِس جیسے دوسرے لوگوں کا خیال رکھو۔ (کتاب الخراج‘ از ابو یوسف‘ ص ۱۳٦)

مدینہ کے اطراف میں ایک نابینا بڑھیا رہتی تھی۔ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ روزانہ علی الصبح اُس کے جھونپڑے میں جا کر اس کے لیے پانی اور دیگر ضروری خدمات انجام دیتے تھے۔ کچھ عرصے بعد آپؓ کو محسوس ہوا کہ کوئی شخص ان سے پہلے آ کر یہ کام کر جاتا ہے۔ ایک روز تحقیق کی غرض سے آپؓ کچھ رات گزرنے کے بعد وہاں تشریف لے گئے تو دیکھا کہ خلیفۂ رسولؐ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ اِس ضعیفہ کی خدمت گزاری سے فارغ ہو کر اُس کے جھونپڑے سے نکل رہے تھے۔

حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے اپنے دورِ خلافت میں اِس بات کا خاص اہتمام کر رکھا تھا کہ ممالک محروسہ (وہ ممالک جو کسی دوسرے ملک کے حکمران کے ماتحت ہوں۔) میں کوئی شخص فقر و فاقہ میں مبتلا نہ ہو۔ آپؓ نے حکم جاری کر رکھا تھا کہ ہر مفلوج اور اپاہج فرد کو بیت المال سے ماہانہ وظیفہ دیا جائے۔ (اسلام اور کفالت عامہ‘ ص ۷۷)

جہاد اور دفاعی ذمہ داریوں سے استثناء

قرآن حکیم نے اسلامی ریاست کے فروغ اور غلبۂ دینِ حق کی جدّوجُہد کے لیے جہاد میں حصّہ لینے کو ایمان واستقامت کی جانچ کے معیار کے طور پر بیان کیا اور اس بنیادی ذمہ داری

سے راہِ فرار اختیار کرنے کو عذابِ الیم کا سبب قرار دیا۔ تاہم معذور افراد کو اِس کلیدی اور بنیادی ذِمہ داری سے مستثنیٰ قرار دیا گیا:

﴿لَيۡسَ عَلَى الۡاَعۡمٰى حَرَجٌ وَّلَا عَلَى الۡاَعۡرَجِ حَرَجٌ وَّلَا عَلَى الۡمَرِيۡضِ حَرَجٌ ؕ وَمَنۡ يُّطِعِ اللّٰهَ وَرَسُوۡلَهٗ يُدۡخِلۡهُ جَنّٰتٍ تَجۡرِىۡ مِنۡ تَحۡتِهَا الۡاَنۡهٰرُ ۚ وَمَنۡ يَّتَوَلَّ يُعَذِّبۡهُ عَذَابًا اَلِيۡمًا ۝١٧﴾ (الفتح)

’’ہاں اگر اندھا‘ لنگڑا اور مریض جہاد کے لیے نہ آئیں تو کوئی حرج نہیں۔ جو کوئی اللہ اور اُس کے رسولؐ کی اطاعت کرے گا‘ اللہ اُسے اُن جنتوں میں داخل کرے گا جن کے نیچے نہریں بہہ رہی ہوں گی۔ اور جو منہ پھیرے گا اُسے وہ دردناک عذاب دے گا۔‘‘

گویا قانونِ اسلام نے معذور افراد کو ناقابلِ برداشت ذمہ داریوں سے مستثنیٰ قرار دیے جانے کو اُن کا بنیادی حق قرار دیا ہے۔ مزید برآں اِس استثناء سے یہ وضاحت کی گئی ہے کہ اِن افراد کو کم تر نہ سمجھا جائے کہ وہ جہاد میں شریک نہیں ہوئے۔ اسلام کی تعلیمات سے یہ امر واضح ہے کہ:

۱) اسلام معذور افراد کو معاشرے کا قابلِ احترام اور باوقار حصّہ بنانے کی تلقین کرتا ہے۔

۲) اسلام اِس امر کی تعلیم دیتا ہے کہ معذور افراد کو خصوصی توجّہ دی جائے اور اُنھیں یہ احساس قطعاً نہ ہونے دیا جائے کہ اُنھیں زندگی کے کسی شعبے میں نظرانداز کیا جا رہا ہے۔

۳) معاشرتی اور قومی زندگی میں ان پر کسی بھی ایسی ذمہ داری کا بوجھ نہ ڈالا جائے جو اِن کے لیے ناقابلِ برداشت ہو۔

۴) اسلام کے عطا کردہ جملہ حقوق کی ادائیگی میں معذوروں کو ترجیحی مقام دیا جائے‘ تاکہ معاشرے میں اِن کے اِستحصال یا محرومی کی ہر راہ مسدود ہو جائے۔

حضرت عمرو بن جموح رضی اللہ عنہ جو سب انصار کے بعد اسلام لائے‘ وہ ایک پاؤں سے لنگڑے تھے۔ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو غزوۂ بدر میں شریک ہونے اور اللہ کی راہ میں جہاد کی تبلیغ فرمائی تو وہ بھی جنگ میں شامل ہونے کے لیے تیار ہو گئے‘ لیکن اُنھیں اُن کے بیٹوں نے جانے سے منع کر دیا۔ پھر جنگِ اُحد کا موقع آیا تو اُنھوں نے اس بار جہاد میں شرکت کا قوی ارادہ کیا‘ مگر اُن کے بیٹوں نے اس بار بھی انہیں بوجہ عذر جنگ میں شمولیت سے منع کر دیا اور ارادہ ترک کرنے کی ترغیب دی۔ اُنھوں نے اپنے بیٹوں کی بات نہ مانی اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کیا: یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم! ’’اگر میرے بیٹے جنگ میں شریک ہو سکتے

ہیں تو مَیں بھی ضرور جاؤں گا۔ اللہ کی قسم! مَیں اُمید رکھتا ہوں کہ میں شہید ہو کر اپنے لنگڑے پن کے ساتھ جنّت میں جاؤں گا''۔ آپ ﷺ نے فرمایا کہ تمہاری معذوری کی وجہ سے تم پر جہاد فرض نہیں ہے۔ یہ اللہ کی طرف سے تمہارے لیے چھوٹ ہے۔ مگر حضرت عمرو بن جموح ؓ نے اصرار کیا کہ میں جہاد میں ضرور جاؤں گا۔ آپ ﷺ نے انہیں جہاد میں شریک ہونے کی اجازت مرحمت فرما دی اور وہ اُسی جنگ میں شہید ہو گئے۔ (اُسد الغابہ' حصہ ہفتم' ص ۶۷۸)

سائل اور محروم کی مدد' ہمارا فرض!

اللہ تعالیٰ نے جہاں خصوصی افراد کو کئی ایک معاملات میں استثناء سے نوازا ہے' وہاں اسلامی سوسائٹی کو اُن کے کئی ایک حقوق سے بھی خبردار کیا ہے تاکہ معاشرے کے افراد محرومین کا حق' اپنا فرض سمجھ کر ادا کریں۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿اِنَّ الۡمُتَّقِيۡنَ فِىۡ جَنّٰتٍ وَّعُيُوۡنٍۙ ⑮ اٰخِذِيۡنَ مَاۤ اٰتٰٮهُمۡ رَبُّهُمۡ‌ ؕ اِنَّهُمۡ كَانُوۡا قَبۡلَ ذٰلِكَ مُحۡسِنِيۡنَ ؕ ⑯ كَانُوۡا قَلِيۡلًا مِّنَ الَّيۡلِ مَا يَهۡجَعُوۡنَ ⑰ وَبِالۡاَسۡحَارِ هُمۡ يَسۡتَغۡفِرُوۡنَ ⑱ وَفِىۡۤ اَمۡوَالِهِمۡ حَقٌّ لِّلسَّآئِلِ وَالۡمَحۡرُوۡمِ ⑲﴾ (الذّٰریٰت)

''یقیناً متقی لوگ (اُس روز) باغوں اور چشموں میں ہوں گے۔ جو کچھ اُن کا رب اُنہیں دے گا اسے (خوشی خوشی) لے رہے ہوں گے۔ وہ اُس دِن کے آنے سے پہلے نیکوکار تھے' راتوں کو کم ہی سوتے تھے' پھر وہی رات کے پچھلے پہروں میں معافی مانگتے تھے' اور اُن کے مالوں میں حق تھا سائل اور محروم کے لیے۔''

یہاں متقی مسلمانوں کا ذکر کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ نے حسب ذیل خوبیاں بیان فرمائی ہیں:

۱) متقی لوگ اللہ کی نعمتوں پر خوش ہوں گے' اس لیے کہ وہ مخلوق میں سے محتاج اور معذور لوگوں کے خیر خواہ اور مددگار رہیں' خواہ وہ اُن سے طلب نہ کریں۔

۲) مالِ صدقات' خیرات اور زکوٰۃ کے علاوہ بھی محروم لوگوں پر اپنے رزق اور مال سے خرچ کرتے رہتے ہیں۔

۳) محروم لوگوں پر رحم کرنے کے خیال سے نہیں' بلکہ اپنے فرائض کی بجا آوری خیال کرتے ہوئے ضرورت مند لوگوں کو تلاش کر کے اُن کی معاونت کرتے ہیں۔

۴) ضرورت مند افراد کو تلاش کر کے اُن کی ضروریات کو پورا کرنا ہی کافی نہیں سمجھتے بلکہ یہ عمل

کرنے کے بعد اللہ کا شکر بھی ادا کرتے ہیں۔

یہ بات جان لینی چاہیے کہ اہل ایمان کے مال و دولت میں سائل اور محروم کے جس حق کا یہاں ذکر کیا جارہا ہے اُس سے مراد زکوٰۃ نہیں ہے جو شرعاً اُن پر فرض کی گئی ہے' بلکہ یہ وہ حق ہے جو زکوٰۃ ادا کرنے کے بعد بھی ایک صاحبِ استطاعت مؤمن اپنے مال میں خود محسوس کرتا ہے۔

معذور افراد کی زندگی کو باسہولت بنانے کے لیے مناسب سہارے کو مہیا کرنا اسلامی معاشرے اور حکومت کا فرض ہے۔

موجودہ دور میں معذور اور خصوصی افراد کو وہیل چیئرز' ٹرائی سائیکل' بیساکھیاں' آلۂ سماعت' خصوصی موٹر بائیک' گاڑی اور مصنوعی اعضاء وغیرہ کی فراہمی کے علاوہ اُن کے لیے خصوصی تعلیمی سکولز' ٹیکنیکل ٹریننگ سنٹرز اور دیگر ضروری ادارہ جات کا قیام اسلامی روایات کی روشنی میں صاحبِ استطاعت لوگوں اور حکومت پر فرض ہے۔ کتنے خسارے کی بات ہوگی کہ ہم مسلمان اور مؤمن بھی کہلوائیں اور اللہ کے بندوں سے تحقیر کا رویّہ بھی اختیار کریں۔ زبانیں حمد و نعت سے مزین ہوں اور ان پر طعنے اور بدزبانی بھی رہے۔ رب کو راضی کرنے کا دعویٰ بھی ہو اور اُس کے بندوں کو ستائیں بھی۔ لوگ ہماری عزّت ہمارے شر کے خوف سے کریں۔ ایسے کردار کے حامل لوگوں کے بارے میں نبی رحمت ﷺ کا فرمان ہماری راہ نمائی اور آخرت کی بہتری کے لیے کافی و شافی ہے۔ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

((بِحَسْبِ امْرِءٍ مِنَ الشَّرِّ أَنْ يَحْقِرَ أَخَاهُ المسلِمَ ۔ كُلُّ الْمُسْلِمِ عَلَى الْمُسْلِمِ حَرَامٌ ' دَمُهُ وَمَالُهُ وَعِرضُهُ)) (متفق عليه)

''کسی مسلمان کے لیے اتنی برائی ہی کافی ہے کہ وہ اپنے مسلمان بھائی کو حقیر سمجھے۔ ایک مسلمان کی دوسرے مسلمان پر ہر شے حرام ہے' اُس کا خون بھی' اُس کا مال بھی اور اُس کی عزّت و آبرو بھی۔''

اللہ سبحانہ وتعالیٰ ہمیں انسانیت کے احترام کا شرف عطا فرمائے۔ اور اپنے اردگرد موجود معذور اور سائل و محروم افراد کا خیال رکھنے' ان پر خصوصی توجّہ دینے اور ان کی مدد کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ (آمین یاربّ العالمین!)

۞۞۞

فتنۂ دجّال اور پیش آمدہ چیلنجز (۲)

آصف حمید

آدم و ابلیس کے درمیان اس معرکۂ خیر و شر کا سلسلہ ازل سے لے کر اب تک جاری ہے۔ ابلیس اور اس کے لشکر کے حملوں میں شدّت کا اندازہ ہر ایک صاحبِ شعور لگا سکتا ہے۔ جیسا کہ پہلی قسط میں قرآن مجید کی آیات کے حوالے سے ابلیس کے دعووں اور اس کے طریقہ واردات کا ذکر کیا گیا تھا۔ آج ہم اپنے اردگرد نظر ڈالیں تو معلوم ہوگا کہ ہر وقت' ہر طرف اور ہر طریقہ سے وہ بنی نوعِ آدم خصوصاً اُمّتِ محمدیہ علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام پر اپنے وار جاری رکھے ہوئے ہے۔ وہ کامیابی کے ساتھ اپنے لشکر اور پیروکاروں میں اضافہ کرتا جا رہا ہے اور اپنے وار کا دائرۂ کار اور دائرۂ اثر وسیع سے وسیع تر کرتا جا رہا ہے۔ اس کا سب سے بڑا مظہر یہ ہے کہ اب لوگوں میں بُرائی سے وہ نفرت نہیں رہی جو پہلے تھی۔ معاشرے میں شرم و حیا اور عفت و عصمت کے جو پیمانے پہلے تھے وہ اب قصہ ٔ پارینہ بن چکے ہیں۔ بے پردگی' عریانی اور فحاشی میں اضافہ روز افزوں ہے۔ اختلاطِ مَرد و زن اب معمول بن گیا ہے اور غیر مخلوط ماحول اجنبی اور نامانوس محسوس ہونے لگا ہے۔

معیشت میں سود اور سودی استحصالی نظام اس قدر قوت پکڑ چکا ہے کہ اب کون ہے جو اس سے اپنے دامن کو بچا سکے؟ حدیثِ رسول ﷺ کے مطابق سود کے ''دُخان'' سے اب کون ہے جو بچا ہوا ہے؟ سیاست میں سیکولرازم اپنی جڑیں مضبوط سے مضبوط کرتا جا رہا ہے۔ خدا اور شریعت کو سیاست سے دور ہی نہیں بلکہ متصادم کیا جا چکا ہے۔ یہ نظریہ غیر مسلموں سے بڑھ کر مسلم دنیا میں زور پکڑ چکا ہے کہ سیاست الگ ہے اور مذہب الگ۔ المختصر! ابلیس نے اپنی مسلسل اور مستقل جِدّ و جُہد سے آج معاشرت' معیشت اور سیاست سے دین و مذہب کو الگ کر دیا ہے۔

قربِ قیامت سے قبل اس معرکۂ خیر و شر کا جو سب سے بڑا میدان سجنے والا ہے' وہ ہے دجّال اور دجّالی فتنہ۔ یہی ہمارا اصل موضوع ہے۔ دجّال اور اس کے فتنہ کے بارے میں

احادیث میں آیا ہے کہ آدمؑ کی تخلیق سے لے کر قیامت کے قائم ہونے تک دجّال سے بڑا کوئی فتنہ نہیں۔ دجّال کی شخصیت کے بارے میں بہت سی احادیث ہیں‘ اُس کی شخصیت کے بارے میں مختلف آراء ہیں۔ کون ہے؟ کدھر سے نکلے گا؟ کیا کرے گا؟ یاد رہے کہ دجّال اولادِ آدم میں سے ایک شخص ہوگا جسے اللہ تعالیٰ لوگوں کی آزمائش اور امتحان کے لیے کچھ ایسی طاقت دے گا جو اُس کے سوا کسی اور کو حاصل نہیں ہوئی۔ نبی اکرم ﷺ نے ہمیں متنبہ کیا ہے کہ ہم اس کی گمراہیوں کو اختیار نہ کریں۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ ہم دجّال اور دجّالیت کے بارے میں آگاہ رہیں۔ حضرت حذیفہ بن یمان رضی اللہ عنہ نبی اکرم ﷺ سے فتنوں کے بارے میں سوال کیا کرتے تھے تاکہ کہیں ان میں مبتلا نہ ہو جائیں۔ فتنوں میں دجّال سب سے بڑا فتنہ ہے۔ نبی اکرم ﷺ کو اپنی اُمّت کے بارے میں اس کا بہت اندیشہ تھا اور یہی وجہ ہے کہ آپ ﷺ نے اس کے بارے میں اُمّت کو خبردار اور آگاہ فرمایا کہ دجّال کے ساتھ بہت سے عظیم فتنے رونما ہوں گے۔

اب ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ آج فتنہ دجّال کے اثرات کس کس طرح اور کہاں کہاں تک پہنچ چکے ہیں‘ اور ان کے بارے میں ہماری آگاہی کس حد تک ہے؟ ہمیں تجزیہ کرنا ہے کہ آج کے دَور میں اِن احادیث کے پورا ہونے کی شکلیں کیا ہیں؟ سب سے پہلے ضرورت اس بات کی ہے کہ ہم یہ جانیں کہ دجّال کا ایجنڈا کیا ہے اور اسی حوالے سے ہم پرکھیں کہ اس ایجنڈے کی تکمیل میں کیا کیا کام پیشگی طور پر ہو رہے ہیں اور کیسے کیسے دجّال کی حکومت کے لیے تیاریاں کی جا رہی ہیں!

خدائی کا دعویٰ!

دجّال یہ دعویٰ کرے گا کہ وہ ’’ربّ العالمین‘‘ ہے۔ وہ لوگوں سے اپنی ذات پر ایمان لانے کا مطالبہ کرے گا۔ چنانچہ نبی اکرم ﷺ نے ایک حدیث میں ارشاد فرمایا: ’’بے شک دجّال کانا ہے اور تمہارا ربّ کانا نہیں ہے‘‘۔ (صحیح البخاری‘ کتاب الفتن‘ ح: ۷۱۳۱) دجّال کے خدائی کے دعویٰ کے حوالے سے مَیں سمجھتا ہوں کہ اہلِ کتاب بالعموم اور اہلِ قرآن یعنی مسلمان بالخصوص جانتے ہیں اور ایمان رکھتے ہیں کہ خدا کبھی انسانی شکل میں سامنے نہیں آئے گا۔ عیسائیوں نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ کا بیٹا بنا تو دیا‘ لیکن پھر بھی خدا کو وہ کسی بھی طرح کا کوئی جسم نہیں دیتے۔ تو کیا ایسا ممکن ہوگا کہ کوئی انسان دُنیا کے سامنے نمودار ہو اور دعویٰ کرے کہ مَیں خدا ہوں اور دنیا اسے مان جائے!

اس حوالے سے مَیں سمجھتا ہوں کہ دجّال کے اس دعوے کے ضمن میں انسانیت تین حصوں میں منقسم ہوجائے گی۔ ایک گروہ ان لوگوں پر مشتمل ہوگا جو واقعی اُس کو خدا مان لیں گے۔ اس قسم کی ذہنیت اور عقیدہ کے لوگ آج بھی موجود ہیں۔ چرچ آف سیٹن آج بھی موجود ہے‘ جس میں ایک گروہ تو باقاعدہ شیطان کی عبادت کرتا ہے۔ اس میں ایک پادری ہوتا ہے جو شیطان کی عبادت کراتا ہے۔ ایک بہت بڑی سوسائٹی ہے جو صرف شیطان کو پوجتی ہے۔ اُن کی مذہبی رسومات ہوتی ہیں۔ یہ لوگ واقعتاً ’’حزبُ الشّیطان‘‘ ہیں۔

دوسری طرح کے لوگ وہ ہوں گے جو واضح طور پر دجّال کو پہچان لیں گے‘ اُس کے ہتھکنڈوں سے بچیں گے‘ اُس کو خدا ماننے سے انکار کردیں گے اور اُس کے خلاف کھڑے ہوجائیں گے۔ یہ وہ لوگ ہیں جنہیں قرآن مجید ’’حزب اللّٰہ‘‘ کے نام سے تعبیر کرتا ہے۔ دجّال ان پر دنیا تنگ کردے گا۔ حضرت حذیفہ بن یمان رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے فرمایا: ’’دجّال کے ساتھ جنّت بھی ہوگی اور آگ بھی۔ اُس کی آگ دراصل جنّت ہے اور اُس کی جنّت حقیقت میں آگ ہوگی‘‘۔ (صحیح مسلم‘ کتاب الفتن و اشراط الساعۃ‘ ح: ۲۹۳۴)۔ ایک اور حدیث میں آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے فرمایا: ’’اُس کے ہمراہ پانی اور آگ ہوگی۔ اُس کی آگ اصل میں ٹھنڈا پانی ہوگی اور اس کا پانی درحقیقت آگ ہوگا۔ اُس کے ہاتھ میں دنیا بھر کے خزانے ہوں گے‘ جسے چاہے گا کھانے کو دے گا اور جس پر چاہے گا رزق کے دروازے تنگ کردے گا۔‘‘ دجّال کے اصل دشمن وہ لوگ ہوں گے جو دجّال کے احکامات کی عملی نفی کریں گے اور اس کے خلاف برسرِ پیکار ہوں گے۔ یہی لوگ حضرت مہدی اور پھر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے ساتھ مل کر اُس کے خلاف جہاد کریں گے۔

تیسری طرح کے لوگ جو مَیں بیان کر رہا ہوں‘ ڈر اِس بات کا ہے کہ اکثریت اُن میں سے ہوگی۔ یہ وہ لوگ ہوں گے جو دجّال کے نظام کو قبول کرلیں گے۔ اصل بات یہ ہے کہ دجّال کو خود کو خدا کہلوا کر کیا مل جائے گا! ہاں‘ وہ اس بات سے خوش ہوگا کہ لوگ اُس کے نظام کے تحت رہنا قبول کرلیں۔ اپنے اپنے گریبانوں میں جھانک کر سوچیں کہ دجّال کے نظام کو قبول کرنے والے کتنے ہوں گے؟ دجّال کے نظامِ معیشت‘ نظامِ سیاست اور نظامِ معاشرت کے آگے سرِ تسلیم خم کردینے والے کتنے ہوں گے؟ خدائی کا دعویٰ تو فرعون نے بھی کیا تھا اور اُس نے

حضرت موسیٰ علیہ السلام کے سامنے دلیل یہ پیش کی تھی کہ کیا یہ مُلکِ مصر میرا نہیں اور یہ نہریں میرے ماتحت نہیں بہتیں! فرعون نے کوئی یہ دعویٰ تو نہیں کیا تھا کہ مجھے سجدہ کرو یا میری پرستش کرو! بلکہ وہ اپنا نظامِ حکومت تسلیم کروا رہا تھا۔

دجّال کے نظام کا اندازہ کسی کو ہے؟ اور اس نظام سے بچنے کی کیا شکل ہوگی؟ کبھی کسی نے سوچا کہ آج بھی ہم کس نظام کے تحت زندگی گزار رہے ہیں؟ کیا یہ اللہ کا نظام ہے یا کسی اور کا؟ ابھی تو دجّال کا ظہور نہیں ہوا تو یہ حال ہے اور جب وہ سامنے آئے گا تو کیا ہوگا؟ اور اس سے بچنا اور اس کے خلاف کھڑے ہونا کس قدر مشکل ہو جائے گا! کیا آج ہم اللہ کے نظام کے مخالف نظام میں زندگی نہیں گزار رہے؟ باطل یا دجّال کا جو نظام اِس وقت دنیا میں رائج ہو چکا ہے' اُس نظام کے تحت مطمئن اور آسودہ زندگی گزار لینا' کیا اُس کو خدا مان لینے کے برابر نہیں؟ بانی محترم ڈاکٹر اسرار احمدؒ کہا کرتے تھے کہ باطل نظام کے تحت پھلنا' پھولنا اور پھیلنا حرام ہے۔ بہرحال وہ یہ بات فقہی لحاظ سے تو نہیں کہا کرتے تھے لیکن اخلاقی اور دینی لحاظ سے یہ بات بالکل صحیح ہے۔

قرآن مجید میں فرمایا گیا ہے: ﴿اَرَءَیۡتَ مَنِ اتَّخَذَ اِلٰـہَہٗ ہَوٰىہُ ؕ﴾ (الفرقان: ۴۳) ''کیا تم نے اُس شخص کو دیکھا جس نے اپنی خواہشِ نفس کو اپنا معبود بنا لیا!'' قرآن کی رو سے خواہشِ نفس کی پیروی کرنا بھی اُس کو معبود بنانے کی ایک شکل ہے۔ خواہشِ نفس کا مطالبہ یہ تو نہیں کہ انسان اُسے سجدہ کرے' بلکہ وہ چاہتی ہے کہ اُس کی پیروی کرنے میں جائز' ناجائز' حلال اور حرام کی کوئی تمیز نہ رکھی جائے۔ اسی طرح جو لوگ دجّال کے نظام ٹھنڈے پیٹوں آرام سے سائنس اور ٹیکنالوجی کی جدید ترقی کو نعمت سمجھتے ہوئے' بسہولت قبول کر لیں گے اور اُس کے خلاف کھڑے نہیں ہوں گے' دجّال کو اُن سے کوئی پرابلم نہیں ہوگا۔

ٹیکنالوجی کا استعمال!

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا گیا کہ دجّال کی رفتار کیا ہوگی؟ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''وہ بارش کے بادلوں کی طرح ہوگا جس کے پیچھے ہوا ہو۔'' (صحیح مسلم' کتاب الفتن واشراط الساعۃ' ح: ۲۹۳۷)۔ مطلب یہ کہ وہ بہت تیزی سے زمین کے ہر حصے میں پہنچ جائے گا۔ اسی طرح ایک اور حدیث میں ہے کہ دجّال ایک گدھے پر سوار ہوگا اور اس گدھے کے کانوں کے درمیان چالیس ہاتھ کا فاصلہ ہوگا۔'' (مسند احمد' ح: ۴۹۵۴) اسی طرح یہ بھی بیان کیا گیا

کہ اس کے گدھے کے ایک قدم اور دوسرے قدم کے درمیان ایک دن رات کی مسافت ہو گی۔ آج سائنسی ترقی اور ٹیکنالوجی کے ہوتے ہوئے ایسا ہونا صرف ممکن ہی نہیں' بلکہ ایسا ہو رہا ہے اور تیز سے تیز تر ذرائع سفر بنائے جا رہے ہیں۔

دجّال کی بات کو سب لوگ سنیں گے۔ وہ آواز دے گا' ایسی آواز کہ اسے مشرق و مغرب کے درمیان سب لوگ سنیں گے۔ آج یہ بات سمجھنا اس قدر آسان ہو گیا ہے کہ ٹیکنالوجی کے بل بوتے پر سوشل میڈیا کے ذریعہ عام انسان بھی اپنی بات پوری دنیا تک پہنچا سکتا ہے۔ لائیو تقاریر و تقاریب کو پوری دنیا دیکھ رہی ہوتی ہے۔ اس حوالے سے ٹیکنالوجی مزید ترقی کر رہی ہے اور ہو سکتا ہے کہ ایسی ٹیکنالوجی ایجاد کر لی جائے جس کے ذریعہ کسی کی آواز پوری دنیا کے لوگ کسی فون یا سمارٹ ڈیوائس کی مدد کے بغیر سن سکیں اور وہ آواز ہر جگہ پہنچ جائے۔ آنے والے دس سالوں میں اس کا امکان نظر آ رہا ہے۔

دجّال کے لیے تمام دریا اور زمین مسخر کر دی جائے گی۔ اُس کا قبضہ تمام زندگی بخش وسائل مثلاً آگ' پانی اور ہوا پر ہو گا۔ دجال اپنے نہ ماننے والوں سے ان کا مال و متاع چھین لے گا اور اپنے ماننے والوں کو دنیا کا ظاہری مال و متاع خوب دے گا۔ (ترمذی' ح: ۲۲۴۰)۔ دجّال کسی علاقے میں سے گزرے گا اور اس علاقے کے لوگ اس کی تکذیب کر دیں گے۔ اس کے نتیجے میں ان کا کوئی جانور نہیں بچے گا' سب ہلاک ہو جائیں گے۔ دوسرے علاقے سے گزرے گا جہاں کے لوگ اس کی تصدیق کریں گے' اس کے نتیجے میں دجال آسمان کو حکم دے گا اور وہ بارش برسانے لگے گا۔ زمین کو حکم دے گا تو وہ خوب غلّہ اگانے لگے گی۔ ان ماننے والوں کے مویشی شام کو اس حال میں آئیں گے کہ پہلے سے زیادہ بڑے اور فربہ ہوں گے' ان کی کوکھیں بھری ہوئی ہوں گی اور ان کے تھن دودھ سے بھرے ہوں گے۔ (کتاب الفتن از حنبل بن اسحاق)۔ دجّال کے پاس روٹیوں کا پہاڑ اور پانی کا دریا ہو گا۔ ان باتوں کے لیے وہ نہایت حقیر ہے' لیکن اللہ تعالیٰ اُسے اس کی اجازت دے گا۔ (صحیح البخاری' کتاب الفتن' باب ذکر الدجال' ح: ۷۰۵ ۶) مطلب یہ کہ اس کے پاس غذا اور پانی وافر مقدار میں ہوں گے اور اللہ تعالیٰ اُس کو یہ چیزیں دے گا تا کہ وہ آزمالے کہ کون اللہ کا ساتھ دیتا ہے اور کون دجال کا!

آپ دیکھ لیں کہ آج ٹیکنالوجی کی مدد سے بارش بھی برسائی جاتی ہے۔ جہاں بارش نہیں

ہوتی وہاں ہو جاتی ہے‘ اور جہاں ہونی چاہیے وہاں قحط کا سامان پیدا کیا جا سکتا ہے۔ آج بنجر زمینوں میں ہریالی اور کیا کچھ نہیں ہو رہا۔ اسی ٹیکنالوجی کی بدولت گرین کنٹری کا خواب سعودی عرب بھی دیکھ رہا ہے۔ اگرچہ ابھی دجّال کا ظہور نہیں ہوا ہے لیکن آپ نظر دوڑائیں تو معلوم ہو گا کہ اس وقت بھی زمین کے خزانوں پر کن حکومتوں کا قبضہ ہے اور ان حکومتوں کی باگ ڈور کن کے ہاتھوں میں ہے‘ اور کس طرح تیزی سے وہ زمین کے ذخائر پر قابو پاتے چلے جا رہے ہیں۔ یہی حکومتیں ہیں جو تیسری دنیا کے غریب ممالک خصوصاً پاکستان کو امداد کے نام پر قرضہ دیتی ہیں۔ اس قرضہ کے ساتھ ساتھ وہ حکومتیں ہمارے ملک میں اپنے ایجنڈے کو بھی لے کر چلتی ہیں اور اس ایجنڈے میں حقوقِ انسانی کے نام پر بے حیائی‘ مادر پدر آزادی‘ خاندانی نظام کی تباہی‘ سودی نظام کو فروغ دینا‘ اسلام اور اسلام پسند لوگوں اور جماعتوں کو متنازعہ بنانا اور پاکستان کو کمزور کرنا وغیرہ شامل ہیں۔ جان لیجیے یہ امداد یا قرضے کسی کی بھلائی یا خیر خواہی نہیں بلکہ شیطانی ایجنڈے کی تکمیل کے لیے دیے جاتے ہیں۔

جادو اور ٹیکنالوجی کی معراج

دجّال مادرزاد اندھے اور کوڑھی کو تندرست کر دے گا اور مردہ کو زندہ کر دے گا (مسند احمد‘ ح: ۲۰۱۵۱) دجّال ایک نوجوان کو مار کر زندہ کر دے گا۔ (مسلم‘ ح: ۲۹۳۸) وہ ایک بدو سے کہے گا: اگر مَیں تمہارے باپ اور ماں کو تمہارے لیے دوبارہ زندہ کر دوں تو تم کیا کرو گے؟ کیا تم شہادت دو گے کہ مَیں تمہارا خدا ہوں؟ بدو کہے گا: ہاں! چنانچہ دو شیاطین اس بدو کے ماں اور باپ کے روپ میں اُس کے سامنے آ جائیں گے اور کہیں گے: ہمارے بیٹے! اس کا حکم مانو‘ یہ تمہارا خدا ہے۔ (ابن ماجہ‘ کتاب الفتن‘ باب فتنة الدجّال‘ ح: ۴۰۷۷) ۔ آج میڈیکل سائنس اس قدر ترقی کر چکی ہے کہ کلوننگ اور آرگن امپلانٹس اب پرانی باتیں شمار ہوتی ہیں۔ ٹیکنالوجی کا استعمال میڈیکل سائنس میں ایک لازمی عنصر کے طور پر موجود ہے۔ ڈی این اے سکیننگ اور ٹیسٹنگ کی سطح پر کسی انسان کی خامی اور خوبی کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے اور مستقبل میں ہونے والی بیماری کے بارے میں پیشین گوئی کی جا سکتی ہے۔ کڈنی امپلانٹ اور لیور امپلانٹ کے بعد ہارٹ امپلانٹ تک بات جا پہنچی ہے۔ کٹے ہوئے اعضاء کی پیوند کاری بھی کی جا رہی ہے۔ اس بات کی یقینی پیشین گوئی کی جا سکتی ہے کہ خروجِ دجّال سے قبل میڈیکل

ٹیکنالوجی واقعی اس حد تک ترقی کر چکی ہوگی کہ بیماری اور شفاء کا کافی حد تک دار و مدار ٹیکنالوجی پر ہوگا۔ اصل خوراک کی جگہ کیمیکلز لے لیں گے۔ ایسا آج کل ہو بھی رہا ہے‘ خصوصاً جنک فوڈ میں‘ جہاں ہم ایسے کیمیکل کھا رہے ہوتے ہیں جن کا ذائقہ کھانے جیسا ہوتا ہے۔ اس کی سب سے سادہ اور آسان مثال جوسز کی ہے۔ ڈبوں پر تو پھلوں کی تصویر ہوتی ہے مگر اندر پانی‘ ذائقہ دینے والے کیمیکلز اور وٹامن کے کیمیکلز کے سوا کچھ نہیں ہوتا۔

جہاں تک معاملہ مُردہ کو زندہ کر دینے کا ہے اس حوالے سے راقم کا ایمان ہے کہ مُردہ کو زندہ کرنا اللہ تعالیٰ کے امر اور اذن کے بغیر ممکن نہیں ہو سکتا۔ انبیاءِ کرام علیہم السلام میں یہ معجزہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو عطا ہوا۔ دجّال اور دجّالیت اس معاملے میں شیطانی طاقتوں کا استعمال کریں گے‘ جس میں شیاطین جن اور جادو کا استعمال ہوگا۔ یہ جان لیں کہ اس وقت دنیا پر کنٹرول کرنے والی طاقتیں شیطانی اور ابلیسی قوتوں کا بھرپور استعمال کر رہی ہیں۔ خصوصاً یہودی اس میں ماہر ہیں اور ان کی رسومات میں ’’قبالہ‘‘ ایک مستند حیثیت کا حامل ہے۔ مخصوص اَعداد و شمار‘ اشارے اور علامتیں قبالہ کی رسومات اور جادو میں بہت اہمیت رکھتی ہیں۔ عرفِ عام میں قبالہ ایک جادو کے سوا کچھ نہیں‘ لیکن اس کی تباہ کاریوں نے دنیا بھر میں جو اثرات قائم کیے ہیں ان سے واقفیت ضروری ہے۔ جادو اور عملیات کے ذریعے اپنے اہداف اور کامیابی حاصل کرنے کے معاملے میں بنی اسرائیل کو ہمیشہ فوقیت حاصل رہی ہے اور یہ تاریخ میں سب سے زیادہ جادو کے ذریعے کام لینے اور اس کی طاقت پر یقین رکھنے والی قوم ہے۔

بنی اسرائیل جب تک فلسطین میں رہے اس وقت تک اس سے ناواقف تھے۔ حضرت یوسف علیہ السلام مصر کے حکمران بنے تو انہوں نے اپنی قوم کو فلسطین سے مصر بلوایا۔ مصر میں رہتے ہوئے فرعون نے اپنی بلند و بالا عمارات اور اہرام کی تعمیر میں ان سے بیگار کا کام لیا اور ان کو انتہائی تنگ دستی اور کسمپرسی کی زندگی گزارنے پر مجبور کیا۔ وہاں ان پر ظلم وستم کے پہاڑ توڑے گئے۔ اس دوران ان میں دو بڑی برائیاں بھی ہو گئیں۔ ان ایک تو ان میں خدائی کا دعویٰ کرنے والے فرعون کو دیکھ کر انتہائی رعونت‘ تکبّر اور غرور پیدا ہو گیا اور دوسرا اُن کو مصر کے اُس زمانے کے انتہائی ماہر جادوگروں سے کالا علم اور جادو سیکھنے کا موقع بھی میسّر آ گیا۔ تاریخ کے اس دور میں مصر اس فن میں پوری دنیا میں یکتا تھا۔ اُس زمانے میں مصر سحر اور جادوگری کا مرکز تھا اور یہ

جادوگر فرعونوں کے لیے ناقابلِ یقین قسم کے کارنامے سرانجام دیا کرتے تھے۔ یہ جادوگر قبالہ جادو کے ماہر تھے‘ جو جادو کی سب سے خوفناک قسم ہے۔ اس میں اس جادو کے ماہرین براہِ راست شیطان سے رابطے میں رہتے ہیں۔ شیطان کامیابی کے لیے نئے نئے گُر سکھاتا ہے اور ایسی ایسی چیزوں کے بارے میں بتاتا ہے جن کے بارے میں عام انسان نہیں جانتے۔ وہ ان سے کام لے کر انتہائی محیرّ العقول قسم کی چیزیں ایجاد کرتے تھے اور ان سے فائدہ اٹھاتے تھے۔ چنانچہ اُس زمانے کے مصری بادشاہوں کے فنِ تعمیر کو دیکھ کر آج بھی عقل حیران رہ جاتی ہے۔ طب کے لحاظ سے ایسے کیمیکلز اور دوائیوں کا استعمال کیا گیا کہ لاشوں کو ہزاروں سال گزرنے کے بعد بھی کوئی گزند نہیں پہنچتا۔

جب موسیٰ علیہ السلام بنی اسرائیل کے ساتھ فلسطین کی جانب واپس آئے تو یہ قوم پہلے جیسی نہیں رہی تھی۔ ان میں فرعونوں جیسی فرعونیت اور شیطانی صفات وعلوم سرایت کر چکے تھے۔ اس قوم کے بہت سے لوگ جادو اور شیطانی عملیات کے ماہر ہو چکے تھے۔ اب وہ اس علم سے دشمنوں کو نقصان پہنچایا کرتے تھے۔ ان لوگوں کا یہ بھی عقیدہ تھا کہ جو طاقت حضرت سلیمان علیہ السلام کے پاس تھی جس کی وجہ سے انہوں نے جِنّات پر قابو پایا تھا‘ وہ بھی قبالہ جادو کی طاقت تھی۔ نعوذ باللّٰہ من ذٰلک! یہودیوں میں قبالہ جادو بہت عام ہے۔ ان میں کچھ لوگ ہیں جو اسی نظریے پر زندگی گزارتے ہیں۔ اس کا درجہ یہودیت میں ایسے ہی ہے جیسے کہ اسلام میں تصوّف کو حاصل ہے۔ یہودی جادو مستقل کرتے رہتے ہیں۔ حضرت سلیمان علیہ السلام کے بعد بنی اسرائیل نے قبالہ کو روحانیت کا درجہ دے دیا اور جادو کی کتابوں کو وہ مقدّس مقام حاصل ہو گیا کہ وہ ہیکلِ سلیمانی میں رکھی جانے لگیں۔ پھر اس قوم پر عذابِ الٰہی کے کوڑے پڑنا شروع ہوئے۔ حضرت سلیمان علیہ السلام کا تعمیر کیا گیا ہیکل پہلے بخت نصر کے ہاتھوں اور بعد میں ٹائیٹس رومی کے ہاتھوں مکمل طور پر تباہ ہو گیا اور یہودی یروشلم سے نکل کر پوری دنیا میں منتشر ہو گئے۔ ہیکلِ سلیمانی کی تباہی کے ساتھ قبالہ جادو کی کتابیں بھی ملبے تلے کہیں دب کر رہ گئیں۔

۱۱۱۸ عیسوی میں یورپ کے نوجوانوں نے یروشلم میں ایک عسکریت پسند تنظیم کی بنیاد رکھی جو تاریخ میں ’’نائٹ ٹیمپلرز‘‘ کے نام سے معروف ہوئی۔ یہ تنظیم جنگجوؤں پر مشتمل تھی جو یروشلم کی زیارت کو آنے والے عیسائیوں کے راستے کو تحفظ فراہم کرنا چاہتے تھے‘ لیکن ان کا اصل مقصد

ہیکلِ سلیمانی کے کھنڈرات میں کھدائی کرنا اور ان جادو کی کتابوں کو نکالنا تھا۔ یہ نوجوان بھی قبالہ جادو کے طالب علم تھے اور چاہتے تھے کہ انہیں ہیکلِ سلیمانی کے کھنڈرات کے نیچے سے قبالہ کی کتب اور اوراق مل جائیں۔ وہ کالا جادو سیکھ کر غیر معمولی طاقتیں حاصل کرنا چاہتے تھے۔ ان میں آج تک یہ تصوّر موجود ہے کہ اس جادو کا استعمال کر کے وہ دنیا پر حکمرانی کرنے کا خواب پورا کر سکتے ہیں۔

یہ تمام تفصیل بتانے کا مقصد یہ ہے کہ یہ جان لیا جائے کہ کسی مُردہ انسان کو بظاہر زندہ کر دینا دجّال اور اس کے کارندوں کے لیے ناممکن نہیں رہے گا۔ اس کے لیے میڈیکل سائنس‘ ڈیجیٹل ٹیکنالوجی اور سب سے بڑھ کر جادو کا استعمال کیا جائے گا۔ ایسی صورت حال پیدا کی جاسکتی ہے جس کے تحت مُردہ شخص زندہ نظر آئے مگر اس وقت اس شخص کے اندر شیطانی طاقتیں حلول کر کے اس کو متحرک کر دیں گی۔ ویسے تو ٹیکنالوجی بھی اس حد تک پہنچ چکی ہے کہ کسی بھی شخص کا ہیولا فائیوڈی اور ہولوگرام ٹیکنالوجی سے روشنی کی مدد سے بہت حد تک حقیقی شکل میں سامنے لایا جاسکتا ہے اور آرٹیفیشل ٹیکنالوجی کی مدد سے وہ انسان نما ہیولا آپ کے تمام سوالوں کے جوابات دے سکتا ہے۔ اس معاملہ میں ٹیکنالوجی مزید ترقی کر رہی ہے اور آہستہ آہستہ آگے بڑھ رہی ہے۔

(جاری ہے)

❁❁❁

ہماری ویب سائٹ

www.tanzeem.org

پر ملاحظہ کیجیے:

☆ تنظیم اسلامی کا تعارف
☆ بانی تنظیم اسلامی محترم ڈاکٹر اسرار احمد کا مکمل دورۂ ترجمۂ قرآن
☆ بانی تنظیم اسلامی اور امیر تنظیم اسلامی کے مختلف خطابات
☆ تلاوتِ قرآن‘ دروسِ قرآن‘ دروسِ حدیث اور خطاباتِ جمعہ
☆ صحیح بخاری‘ صحیح مسلم‘ موطا امام مالک اور اربعین نوویؒ کے تراجم
☆ میثاق‘ حکمت قرآن اور ندائے خلافت کے تازہ اور سابقہ شمارے
☆ اردو اور انگریزی کتابیں
☆ آڈیو رویڈیو کیسٹس رسی ڈیز اور مطبوعات کی مکمل فہرست

ربوبیتِ ربّ

پروفیسر محمد یونس جنجوعہ

اللہ تعالیٰ وحدہٗ لاشریک خالق کائنات ہے۔ وہ ہر قسم کی مخلوق کا جہاں خالق ہے وہاں ربّ بھی ہے۔ خالق مخلوق کی ہر نوع کو اُس کے مناسب روزی دے رہا ہے۔ وہ چرند پرند اور ہر قسم کے جانوروں کو خوراک مہیّا کرنے والا ہے۔ کچھ جانور سبزہ کھانے والے ہیں' ان کے لیے سبزہ موجود ہے۔ کچھ گوشت خور ہیں تو ان کے لیے گوشت کا انتظام ہے۔ غرض مخلوقات کی ہر نوع کو ضرورت کے مطابق رزق مل رہا ہے۔ انسان کے علاوہ دوسری جاندار مخلوق کی روزی کا انتظام اس طرح ہے کہ وہ زمین پر گھومتے پھرتے ہیں اور ان کو روزی مل جاتی ہے' انہیں روزی کمانی نہیں پڑتی۔ پرندوں کو دانہ دنکا مل جاتا ہے۔ گوشت خور جنگلی جانوروں کے لیے جنگل میں وہ جانور موجود ہیں جن کا گوشت ان کے لیے مہیّا ہے۔ پالتو جانوروں کا رازق بھی اللہ ہے۔ گھوڑے' گدھے کو انسان پالتا ہے تو اُن سے بار برداری کا کام لیتا ہے۔ گائے' بھینس' بھیڑ' بکری سے وہ دودھ حاصل کرتا ہے اور ان کا گوشت کھاتا ہے۔ چونکہ وہ پالتو جانوروں کو اپنے مفاد کے لیے رکھتا ہے اس لیے ان کی خوراک کا انتظام بھی اسے کرنا پڑتا ہے۔ انسان اللہ تعالیٰ کی انوکھی مخلوق ہے۔ اسے عقل و شعور حاصل ہے' اس لیے اسے جانوروں کی طرح روزی نہیں ملتی بلکہ اسے محنت مشقت کر کے روزی کمانا پڑتی ہے۔ انسان جو جانور پالتا ہے ان کی خوراک کا بھی ذمہ دار ہوتا ہے۔

ہر انسان کی تگ و دو مختلف ہے' اس طرح اس کی کمائی کی مقدار بھی مختلف ہو جاتی ہے۔ انسان مختلف پیشوں کے ساتھ وابستہ ہیں اور اپنی روزی کمانے کی دھن میں لگے ہوئے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے عقل و شعور دے کر انسان کو اس بات کا مکلّف بنایا ہے کہ روزی کمانے میں جائز ذرائع استعمال کرے۔ اگر وہ ناجائز ذرائع سے روزی کماتا ہے تو اللہ تعالیٰ کا نافرمان ٹھہرتا ہے اور سزا کا مستحق بنتا ہے۔ دو انسان برابر کا کام یا برابر کی محنت کرتے ہیں مگر دونوں کی کمائی برابر نہیں ہوتی' کیونکہ روزی کو گھٹانا بڑھانا اللہ تعالیٰ کے اختیار میں ہے۔ قرآن مجید میں ارشاد ہے: ﴿اَللّٰہُ

﴿يَبۡسُطُ الرِّزۡقَ لِمَنۡ يَّشَآءُ وَيَقۡدِرُ ؕ﴾ (الرعد:٢٦) ’’اللہ تعالیٰ روزی کشادہ کرتا ہے جس کے لیے چاہتا ہے‘ اور جس کے لیے چاہتا ہے تنگ کر دیتا ہے‘‘۔ یہی انسان کا امتحان ہے کہ وہ اپنی روزی کمانے میں جائز طریقے اختیار کرتا ہے یا ناجائز۔ اگر وہ جائز طریقوں سے روزی کماتا ہے تو اُس کا یہ عمل ایک نیکی بن جاتا ہے اگرچہ وہ اسے اپنی اور اپنے اہل وعیال کی مادی ضروریات پر ہی خرچ کرے۔ ناجائز ذرائع سے کمانا اور ناجائز جگہ پر خرچ کرنا دونوں ہی ناپسندیدہ فعل ہیں۔ ایسا کرنے والا گناہ کماتا ہے اور وہ سزا پائے گا۔

ہر انسان کی روزی مقدّر ہے‘ اب یہ اُس کی مرضی ہے کہ وہ اپنا نصیب جائز طریقے سے حاصل کرے یا ناجائز ذریعے سے۔ روزی کمانے کے لیے جِدّ وجُہد کرنا انسان پر لازم ہے‘ لیکن روزی کا کشادہ ہونا اُس کے اختیار میں نہیں۔ اللہ تعالیٰ کا کوئی بھی کام حکمت سے خالی نہیں۔ روزی کے معاملے میں بھی اللہ تعالیٰ کا یہ فیصلہ کہ کچھ کو کثرت کے ساتھ دولت دیتا ہے اور کسی کو فقیر اور مسکین رکھتا ہے‘ عین عدل اور حکمت پر مبنی ہے۔ جسے اللہ تعالیٰ کشادہ روزی دیتا ہے وہ درحقیقت امتحان میں ہے کہ روزی کو ناجائز خرچ کرتا ہے یا جائز۔ اگر وہ اسے جائز ضروریات پر خرچ کرتا ہے تو ثواب پاتا ہے‘ نیز نعمتوں کی سہولت پر اُسے شکر کا بھی موقع ملتا ہے جس کی بڑی فضیلت ہے۔ اگر وہ دولت کو عیش وعشرت میں لٹاتا ہے یا دوسروں پر ظلم کرتا ہے تو یہی دولت اُس کے لیے خسارے کا باعث بنتی ہے۔ اسی طرح اگر نادار شخص مال دار لوگوں کو حسرت کی نگاہ سے دیکھتا رہا اور اپنی غربت پر کڑھتا رہا تو اُخروی اعتبار سے وہ ناکام رہا۔ اگر وہ دولت کی کمی پر صبر کرتا تو اجر پاتا۔ روزی کی تنگی پر اگر شکوہ نہ کیا جائے تو بے حساب اجر کا وعدہ ہے۔ غریبوں کا حساب آسان ہوگا جبکہ امیروں کی دولت ان کے حساب کو مشکل بنا دے گی۔ اسی لیے بتایا گیا ہے کہ غریب اور مسکین لوگ امیروں اور دولت مندوں سے پہلے جنّت میں جائیں گے۔

امیروں پر لازم ہے کہ اپنے وافر مال کو ضرورت مندوں پر خرچ کریں۔ اس طرح ناداروں کی ضروریات کا بندوبست ہو جائے گا۔ زکوٰۃ ہر مال دار پر فرض ہے۔ یہ اسلام کا بنیادی رکن ہے۔ جس مسلمان معاشرے میں زکوٰۃ ادا کرنے میں کوتاہی کی جاتی ہو وہاں پھر بھکاری پائے جائیں گے جو سب کے لیے شرمندگی کا باعث ہوں گے۔ ایک وہ دور تھا کہ ہر مسلمان صاحبِ نصاب زکوٰۃ دینے کے لیے نکلتا تھا تو کوئی لینے والا نہ ملتا تھا۔ یہ ہے وہ نظام جو اللہ تعالیٰ نے خوش حال مسلمانوں پر حکماً نافذ کر رکھا ہے تاکہ کوئی ایسا تنگ دست نہ رہے جس کو بھیک مانگنا پڑے۔ زکوٰۃ

کے بارے میں قرآن مجید میں ارشاد ہے: ﴿وَفِیۡۤ اَمۡوَالِہِمۡ حَقٌّ لِّلسَّآئِلِ وَالۡمَحۡرُوۡمِ ﴿۱۹﴾﴾ (الذّٰریٰت) ’’اور ان (امیروں) کے مالوں میں سوالیوں اور ناداروں کا حق ہے۔‘‘ گویا کہا جاسکتا ہے کہ اگر امیر لوگ اپنے مال میں سے ناداروں کا حق ادا نہیں کرتے تو ایک طرح سے وہ حرام کھاتے ہیں‘ چاہے انہوں نے یہ مال جائز طریقے سے کمایا ہو۔ جو زکوٰۃ کا انکار کرے وہ دائرہ اسلام سے نکل جاتا ہے۔ مسلمانوں پر تو لازم ہے کہ وہ زکوٰۃ کے علاوہ صدقاتِ نافلہ کا بھی انتظام کریں اور یوں اللہ تعالیٰ کی رضا حاصل کریں۔

غریبوں اور ناداروں کی روزی کا اگر زکوٰۃ اور صدقات سے انتظام ہو جائے تو اس سے اللہ تعالیٰ کا منشا پورا ہو جائے اور اس کی حکمتیں بھی عیاں ہو جائیں۔ کشادہ روزی والوں کو شکر کا موقع میسّر آ جائے اور نادار صبر کا اجر پائیں۔ شکر اور صبر وہ نعمتیں ہیں کہ جن کو مل جائیں وہ قیامت کے دن عزّت پائیں گے۔ اس طرح سے اللہ تعالیٰ نے غریب اور فقیر لوگوں کی کفالت کا انتظام کر رکھا ہے۔ یہ وہی انداز ہے کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید کے متن کی حفاظت کا ذمہ تو خود لیا ہے مگر رسول اللہ ﷺ کی احادیث کی حفاظت انسانوں کے ذریعے کی ہے۔ احادیث کی حفاظت بھی ضروری تھی‘ کیونکہ آپ ﷺ کی زندگی کو انسانوں کے لیے نمونہ بنایا گیا۔

دنیا کی زندگی میں لوگ مل جل کر رہتے ہیں۔ ان میں کچھ امیر کبیر ہوتے ہیں جنہیں دولت کے بل بوتے پر زندگی کو آسودہ بنانے کے لیے ہر چیز میسّر ہوتی ہے۔ کچھ مفلس اور نادار ہوتے ہیں جو مشکل سے گزارہ کرتے ہیں اور بعض کو تو پیٹ بھر کر روزی بھی نہیں ملتی۔ ایسے لوگ اگر رسول اللہ ﷺ کی زندگی کو دیکھیں تو ان کو صبر کی توفیق ملتی ہے‘ وہ شکوہ و شکایت کا لفظ زبان پر نہیں لاتے۔ وہ دیکھتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ کے گھر میں تو ہفتوں چولہا نہیں جلتا تھا۔ دراصل دُنیا کی زندگی ہر شخص کے لیے امتحان ہے۔ ثروت مند دنیاوی مال و دولت کی بہتات میں اکثر و بیشتر عیش و آرام میں مگن رہتے ہیں۔ وہ لوگ خوش قسمت ہیں جو حلال طریق سے مال کماتے ہیں اور جائز کاموں میں خرچ کرتے ہیں۔ فضول خرچی سے بچ کر زندگی گزارتے ہیں اور ضرورت مندوں پر اپنا مال خرچ کرنے سے دریغ نہیں کرتے۔ جو غریب اور نادار ہیں‘ وہ حسد سے بچ کر میسّر روزی پر قناعت کرتے ہیں۔ مختصر یہ کہ یہاں ہر شخص ایک آزمائش میں ہے۔ مال دار شکر کریں تو کامیاب اور مفلس و نادار صبر سے زندگی گزاریں تو کامیاب! ہر شخص اپنا جائزہ لیتا رہے کہ وہ نجات پانے والے راستے پر چل رہا ہے یا اس کی زندگی خسارے میں جا رہی ہے۔

❁❁❁

علمِ تفسیر کی ضرورت و اہمیت

بسلسلہ علمِ تفسیر اور مفسّرین کرام (۱۳)

پروفیسر حافظ قاسم رضوان

تفسیر کی ضرورت اور اہمیت ثابت کرنے کے لیے جو دلائل سامنے آتے ہیں' انہیں ہم دو حصّوں میں تقسیم کر سکتے ہیں: (۱) نقلی دلائل' اور (۲) عقلی دلائل

(۱) نقلی دلائل

نقلی دلائل کو ہم درج ذیل حصّوں میں تقسیم کر لیتے ہیں:

(ا) تفسیر کی ضرورت اور تاکید: قرآن حکیم کی روشنی میں

(ب) تفسیر کی اہمیت وفضیلت: حدیث مبارکہ کے حوالے سے

(ج) تفسیر اور تعامل صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم

(د) تفسیر اور تعامل علمائے اُمّت

(ا) تفسیر: قرآن مجید کی روشنی میں

کلام اللہ کی روشنی میں یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ قرآن کی تشریح وتوضیح حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے فرائض رسالت میں شامل ہے۔ سورۂ آلِ عمران میں ارشاد ہوتا ہے:

﴿لَقَدۡ مَنَّ اللّٰہُ عَلَی الۡمُؤۡمِنِیۡنَ اِذۡ بَعَثَ فِیۡہِمۡ رَسُوۡلًا مِّنۡ اَنۡفُسِہِمۡ یَتۡلُوۡا عَلَیۡہِمۡ اٰیٰتِہٖ وَ یُزَکِّیۡہِمۡ وَ یُعَلِّمُہُمُ الۡکِتٰبَ وَ الۡحِکۡمَۃَ ۚ وَ اِنۡ کَانُوۡا مِنۡ قَبۡلُ لَفِیۡ ضَلٰلٍ مُّبِیۡنٍ ﴿۱۶۴﴾﴾

''بلاشبہ اللہ تعالیٰ نے مؤمنین پر بہت بڑا احسان کیا کہ انہی میں سے ایک رسول ان میں

بھیجا جو ان کو اللہ تعالیٰ کی آیات سناتا ہے اور ان کا تزکیۂ نفس کرتا ہے اور انہیں کتاب و حکمت کی تعلیم دیتا ہے۔ اور یقیناً یہ سب اس سے پہلے کھلی گمراہی میں تھے۔''

الفاظِ قرآنی: ''وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ'' میں مذکور تعلیم صرف الفاظ کے پڑھنے پڑھانے کا نام نہیں' بلکہ اس میں تشریح و تفسیر بھی شامل ہے۔ اسی طرح فرمانِ باری تعالیٰ ہے:

﴿وَاَنْزَلْنَآ اِلَيْكَ الذِّكْرَ لِتُبَيِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ اِلَيْهِمْ﴾ (النحل: ۴۴)

''اور ہم نے (اے رسول ﷺ!) آپ پر الذکر (قرآن) نازل کیا تاکہ آپ لوگوں کے سامنے اس کلام کی وضاحت کر دیں جو ان کی طرف نازل کیا گیا۔''

یہ 'تبیین کلام' توضیح و تفسیر کا ہی دوسرا نام ہے۔ سورۂ ص میں یہ مضمون یوں آیا ہے:

﴿كِتٰبٌ اَنْزَلْنٰهُ اِلَيْكَ مُبٰرَكٌ لِّيَدَّبَّرُوْٓا اٰيٰتِهٖ وَلِيَتَذَكَّرَ اُولُوا الْاَلْبَابِ ۝۲۹﴾

''یہ بابرکت کتاب ہے جس کو ہم نے آپؐ پر نازل کیا' تاکہ لوگ اس کی آیات میں غور و فکر کریں اور عقل مند نصیحت حاصل کریں۔''

تدبّر و تفکّر کا نتیجہ تشریح و تفسیر قرآن کی صورت میں ہی سامنے آتا ہے۔ اسی طرح سورۃ القمر میں فرمایا گیا:

﴿وَلَقَدْ يَسَّرْنَا الْقُرْاٰنَ لِلذِّكْرِ فَهَلْ مِنْ مُّدَّكِرٍ ۝﴾

''اور ہم نے قرآن کو یاددہانی کے لیے آسان بنا کر بھیجا ہے' پس کوئی ہے اس سے نصیحت حاصل کرنے والا؟''

ظاہر ہے یہ نصیحت حاصل کرنا قرآن مجید کی تشریح اور تفسیر سمجھنے سے ہی ہو سکتا ہے۔ گویا ارشاداتِ قرآنی سے ہی یہ بات واضح ہوتی کہ قرآن کریم کے لیے علمِ تفسیر ضروری ہے۔

(ب) تفسیر کی اہمیت: احادیث کی روشنی میں

حضورِ اقدس ﷺ کے قول و فعل سے قرآن حکیم کی تفسیر ثابت ہے اور مسلمانوں کو بھی آپؐ نے اس کا حکم دیا۔ جیسے حضرت مجاہدؒ سے مروی ارشادِ نبوی ہے:

((عَلِّمُوْا رِجَالَكُمْ سُوْرَةَ الْمَائِدَةِ وَعَلِّمُوْا نِسَاءَكُمْ سُوْرَةَ النُّوْرِ))

''اپنے مردوں کو سورۃ المائدہ اور اپنی عورتوں کو سورۃ النور سکھاؤ۔''

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے حضرت ضحاکؒ مرفوعاً روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ

نے فرمایا: ''اللہ تعالیٰ کے ارشاد یُؤْتِی الْحِکْمَۃَ سے قرآن کا عطا کرنا مراد ہے''۔ حضرت ابن عباسؓ نے وضاحت کی کہ ''قرآن کا عطا کرنا'' سے مراد قرآن کی تفسیر کرنا ہے' کیونکہ پڑھنے کو تو نیک و بدسب ہی پڑھتے ہیں۔ امام بیہقی وغیرہ نے حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مرفوعاً روایت کیا ہے کہ قرآن مجید کی تعریب (تفسیر) کرو اور اس کے غریب اور نامانوس الفاظ کی تلاش میں سرگرم رہو (تاکہ اس کا مفہوم سمجھ سکو)۔ اسی طرح آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کے حق میں دعا فرمائی: ((اَللّٰھُمَّ فَقِّھْہُ فِی الدِّیْنِ وَعَلِّمْہُ التَّأْوِیْلَ)) (صحیح ابن حبان' ح:۷۰۵۵) ''اے اللہ! اس کو دین کا فہم بخش اور اسے قرآن کی تفسیر (تاویل) سکھا دے۔''

(ج) تفسیر اور تعامل صحابہ کرامؓ

حیاتِ نبویؐ کے بعد صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے دور میں بھی تفسیر قرآن کا سلسلہ برابر جاری رہا۔ اصحابِ رسول کے مختلف مقامات پر باقاعدہ حلقہ ہائے درسِ قرآن قائم تھے۔ جیسے مکہ مکرمہ میں حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما اور ان کے تلامذہ' مدینہ منورہ میں حضرت اُبی ابن کعب رضی اللہ عنہ اور ان کے تلامذہ اور کوفہ میں حضرت علی رضی اللہ عنہ' حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ اور ان کے شاگرد قرآن مجید کی تشریح و توضیح اور تفسیر (تاویل) کا فریضہ سرانجام دیتے تھے۔ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے حضرت سعید بن جبیرؒ روایت کرتے ہیں کہ انہوں نے فرمایا: ''جو شخص قرآن کریم پڑھتا ہے اور اس کی تفسیر اچھی طرح نہیں کر سکتا' اس کی مثال اس اعرابی کی سی ہے جو شعر کو بغیر سوچے سمجھے اور غیر موزوں انداز میں پڑھتا ہے''۔ ایسے ہی حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کا ارشاد ہے: ''بے شک مجھے یہ زیادہ پسند ہے کہ مَیں قرآن کی کسی ایک آیت کی تعریب (تفسیر و توضیح) کروں' بہ نسبت اس بات کے کہ میں اس کی ایک آیت حفظ کر لوں''۔ مشہور تابعی مسروقؒ کا کہنا ہے کہ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ ہمیں ایک سورت پڑھ کر سناتے اور دن کا اکثر حصّہ اس کی تفسیر بیان کرنے میں صَرف کر دیتے۔

(د) تفسیر اور تعامل علمائے اُمّت

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے بعد تابعین و تبع تابعین اور اس کے بعد پھر ہر آنے والے دور میں تفسیر قرآن کا عمل برابر جاری رہا اور بحمدہٖ آج تک جاری ہے۔ اہل علم نے اپنے قول و فعل سے یہ بات ثابت کی کہ تفسیر کا بنیادی علم حاصل کرنا نہایت ضروری ہے' کیونکہ اس کے بغیر قرآن کریم

کا فہم حاصل کرنا اور پھر اس پر عمل کرنا ممکن ہی نہیں۔ علمائے کرام اور مفسرین عظام نے بڑی بڑی کتب تفاسیر تصنیف کی ہیں‘ جیسے امام رازیؒ کی تفسیر مفاتیح الغیب‘ امام ابن جریر طبریؒ کی تفسیر طبری‘ امام بیضاویؒ کی تفسیر بیضاوی‘ علامہ محمود آلوسیؒ کی تفسیر روح المعانی‘ علامہ زمخشریؒ کی تفسیر الکشاف‘ علاوہ ابوبکر جصاصؒ کی تفسیر احکام القرآن وغیرہ۔

(۲) عقلی دلائل

امام ابن تیمیہؒ بیان کرتے ہیں کہ یہ بات تشریح طلب نہیں کہ اللہ تعالیٰ اپنی مخلوق کو ایسی زبان سے مخاطب فرماتے ہیں جس کو وہ لوگ اچھی طرح سمجھتے ہیں‘ اسی لیے پروردگار نے ہر ایک رسول اور نبی کو اُس کی قوم میں انہی کی زبان کے ساتھ بھیجا اور اپنی الہامی کتب کو متعلقہ قوموں کی ہی زبان میں نازل فرمایا۔ اب رہی یہ بات کہ پھر تفسیر کی حاجت کیوں؟ تو اس کا جواب ایک قاعدے اور ضابطے کے فہم کے بعد سمجھ آئے گا۔ وہ قاعدہ یہ ہے کہ انسانوں میں سے جو شخص کوئی کتاب تصنیف کرتا ہے تو وہ بنیادی طور پر اپنا سبق یاد کرنے کے لیے تصنیف کرتا ہے اور اس وقت اس کی کوئی مزید تشریح نہیں کرتا۔ لیکن پھر اس کتاب کی وضاحت کی حاجت تین وجوہ سے پیدا ہوتی ہے:

(اوّل) تصنیف کتاب میں مصنف کی فضیلت کا کمال ہے کہ وہ اپنی علمی قوت سے بلیغ لفظوں میں دقیق معانی کو جمع کر دیتا ہے‘ اس لیے بسا اوقات مصنف کی صحیح مراد کو سمجھنا مشکل ہو جاتا ہے۔ لہٰذا ایسی صورت میں تشریح و توضیح سے ان مخفی معنوں کا اظہار مقصود ہوتا ہے جو کہ بظاہر آنکھ سے اوجھل ہوتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ بعض علماء نے ضرورت کے وقت اپنی تصانیف کی شرح خود ہی تحریر کی ہے اور یہ دوسرے لوگوں کی لکھی ہوئی متعلقہ شروح کی نسبت صاحبِ کتاب کی مراد پر بہت زیادہ دلالت کرنے والی ہیں۔

(دوم) مصنف اپنی کتاب میں چند اصول وضوابط اور مسائل کی وضاحت کے لیے کچھ مزید تشریحات اس خیال سے نظر انداز کر دیتا ہے کہ وہ امور اور شروط تو بالکل واضح ہیں‘ یا ان کو اس لیے درج نہیں کرتا کہ ان باتوں کا تعلق چند دوسرے علوم سے ہوتا ہے جن کی بظاہر قاری کو اتنی سوجھ بوجھ نہیں ہوتی۔ لہٰذا ایسی حالت میں تشریح و توضیح کرنے والے کو

متعلقہ محذوف امور اور اس کے مراتب کے بیان کی حاجت پیش آتی ہے۔

(سوم) ایک لفظ میں کئی معنوں کا احتمال ہوتا ہے' جیسا کہ مجاز' اشتراک اور دلالت التزام کی صورتوں میں پایا جاتا ہے۔ اب ان صورتوں میں شارح پر لازم ہے کہ وہ مصنف کی غرض کو پہچان کر واضح کرے اور اسے دیگر معنوں پر ترجیح دے وغیرہ۔

اس وضاحت کے بعد علمِ تفسیر کی اہمیت کے حوالے سے امام جلال الدین سیوطیؒ کا درج ذیل بیان ملاحظہ کریں:

''قرآن افصح العرب حضورِ اقدس ﷺ کے عہد میں بزبانِ عربی نازل ہوا۔ حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اس میں بیان کردہ مسائل و احکام سے آگاہ تھے' البتہ اس کے باطنی دقائق و حقائق بحث و نظر اور حضور کریم ﷺ سے دریافت کرنے پر ہی معلوم ہو سکتے تھے۔ جب سورۃ الانعام کی یہ آیت نازل ہوئی: ﴿اَلَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا وَلَمۡ یَلۡبِسُوۡۤا اِیۡمَانَہُمۡ بِظُلۡمٍ﴾ (آیت ۸۲) ''جو لوگ ایمان لائے اور انہوں نے اپنے ایمان کو ظلم کے ساتھ آلودہ نہیں کیا'' تو صحابہ کرامؓ نے حضور اکرم ﷺ سے عرض کیا کہ ہم میں سے کون ہے جس نے کبھی ظلم نہیں کیا؟ اس پر آپ ﷺ نے جواب دیا کہ یہاں ظلم سے مراد شرک ہے۔ اس کی تائید میں رسول اکرم ﷺ نے (سورۂ لقمان کی) یہ آیت تلاوت فرمائی: ﴿اِنَّ الشِّرۡكَ لَظُلۡمٌ عَظِیۡمٌ ﴿۱۳﴾﴾ ''بے شک شرک بہت بڑا ظلم ہے۔'' اسی طرح ایک مرتبہ حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا: ((مَنۡ نُوۡقِشَ الۡحِسَابَ عُذِّبَ)) ''جس پر محاسبۂ اعمال کے وقت جرح کی گئی' اسے عذاب دیا جائے گا۔'' یہ سن کر حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے عرض کیا کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ﴿فَسَوۡفَ یُحَاسَبُ حِسَابًا یَّسِیۡرًا ﴿۸﴾﴾ ''پس محاسبۂ اعمال آسانی سے کیا جائے گا'' پھر یہ سختی کیسے ہوگی؟ آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ یہ سہولت اعمال پیش کرتے وقت دی جائے گی اور جیسے کہ سورۃ البقرہ میں فرمانِ الٰہی ہے: ﴿وَكُلُوۡا وَاشۡرَبُوۡا حَتّٰی یَتَبَیَّنَ لَكُمُ الۡخَیۡطُ الۡاَبۡیَضُ مِنَ الۡخَیۡطِ الۡاَسۡوَدِ مِنَ الۡفَجۡرِ ۪﴾ (آیت ۱۸۷) ''اور تم کھاتے پیتے رہو' یہاں تک کہ صبح کا سفید دھاگہ سیاہ دھاگے سے ظاہر ہو جائے (پہچانا جائے)۔'' اب حضرت عدی بن حاتم کے واقعے میں حضور ﷺ نے اس کی وضاحت فرمائی کہ سیاہ دھاگے سے رات اور سفید دھاگے سے دن مراد ہے۔ اس کے علاوہ اور بہت سی دوسری باتیں ہیں جنہیں صحابہ کرامؓ نے ایک ایک کر کے نبی

کریم ﷺ سے دریافت کیا تھا‘ اور ہم لوگ بھی ان باتوں کے محتاج ہیں جن کے محتاج صحابہ کرامؓ تھے۔ علاوہ ازیں ظاہری احکام میں سے بھی ایسے امور کے علم کی حاجت ان حضراتؓ کو ہرگز نہ تھی‘ لیکن ہماری اس احتیاج کا سبب ہمارا لغت کے فہم سے قاصر ہونا ہے‘ لہٰذا ہم کو ان تمام لوگوں سے بڑھ کر تفسیر کی ضرورت اور حاجت ہے۔‘‘

یہ بھی ایک مسلّمہ امر ہے کہ تمام اشخاص یکساں فہم و فراست‘ تفکّر و تدبّر اور صلاحیت و قابلیت کے نہیں ہوتے‘ کوئی کج فہم ہے تو کوئی زود فہم‘ کوئی ذکی ہے تو کوئی بالکل غبی وغیرہ۔ اسی وجہ سے کوئی بات سمجھنے میں ہر کوئی ایک جیسا نہیں ہوتا۔ پھر عام لوگوں کی تحریر و تقریر تو الگ رہی‘ جب معاملہ اللہ تعالیٰ کے کلام اور کتاب کا ہو جس کی جامعیت‘ ہمہ گیری اور وسعت کا کچھ ٹھکانہ نہیں‘ جس میں بے شمار مطالب و تراجم‘ فصاحت و بلاغت‘ اوصافِ کلام اور معانی و بدائع کا ایک چمن کھلا ہوا ہے‘ تو پھر ظاہر ہے کہ ایسے عظیم کلام کی تشریح و تفسیر ایک لازمی امر ہے تاکہ زیادہ سے زیادہ لوگ اس سے استفادہ کر سکیں۔

اس بات کو بھی ملحوظِ خاطر رکھنا چاہیے کہ قرآن عزیز ایک طرح سے اصول و کلیات کی کتاب ہے‘ جس میں جزئیات نگاری سے کام نہیں لیا گیا اور نہ ہی اس میں تفصیلات اور فروعی نکات کا باب کھولا گیا ہے۔ ایسی صورت میں ظاہر ہے کہ ان اصول و کلیات کی تشریح اور جزئیات و تفصیلات کی تبیین و تفسیر لازم ہو جاتی ہے۔ نیز قوانین و احکام کی تفصیلی صورت‘ حدود و قیود اور ان کا مختلف صورتوں میں اطلاق واضح طور پر متعین ہونا چاہیے۔ اس اہم ضرورت کو صرف علم تفسیر ہی پورا کرتا ہے۔ اور یہ ایسا علم تفسیر ہو جو سلف صالحین کے منہج سے جڑا ہوا ہو۔

افراد و اُمم کی ترقی اور اتحاد کا راز قرآنی تعلیمات کی ہی پیروی اور اس کی حکیمانہ نظم و ترتیب میں منحصر ہے۔ قرآن مجید بنی نوع انسان کی فلاح و صلاح کے جملہ اجزاء و عناصر پر مشتمل ہے۔ اب یہ ایک بدیہی امر ہے کہ قرآنی احکام و تعلیمات کی تعمیل قرآن کریم کے فہم و تدبّر کے بعد ہی ممکن ہے۔ کلام اللہ جس رشد و ہدایت کو اپنے اندر سموئے ہوئے ہے اور اس کا معجزانہ اسلوبِ بیاں جن حکمتوں کا جامع ہے‘ جب تک ان سے صحیح آگاہی حاصل نہ کی جائے‘ تب تک قرآن عزیز کی مکمل پیروی کا کوئی امکان نہیں۔ یہ اسی صورت ممکن ہے کہ ہم قرآنی الفاظ کے معانی و مطالب کو سمجھنے کی کوشش کریں اور اس کے اوامر و نواہی کا صحیح ادراک کریں۔ علم تفسیر اس ضمن میں معاون ثابت ہوتا ہے‘ جس کے بغیر کوئی چارہ نہیں۔

عصرِ حاضر میں عربی زبان و ادب سے شغف نہیں رہا اور نہ براہِ راست قرآن سے ہدایت حاصل کرنے کی کوئی لگن ہے‘ اس لیے موجودہ دور میں علم تفسیر کی ضرورت پہلے سے بھی بہت زیادہ ہے۔ کتابِ الٰہی بنی نوعِ انسان کی فوز و فلاح اور ہدایت کے لیے نازل ہوئی ہے جو عظیم علمی ذخائر کی جامع‘ اعلیٰ ترین الہامی تعلیمات کی حامل اور کامل حکمتوں کا گنجینہ ہے۔ علم تفسیر ہی ان تمام خزانوں کی کنجی ہے جس کے بغیر قرآنی علوم و معارف کا باب نہیں کھل سکتا۔ قرآنی الفاظ اور آیات کو جتنا بھی دہرایا جائے‘ ثواب تو حاصل ہو جائے گا لیکن ان کا مفہوم و معنی اور مراد علم تفسیر کے بغیر معلوم نہیں ہو سکتا۔ نسخہ ہائے قرآن اور حفاظ کی کثرت کے باوجود اُمّتِ مُسلمہ جس تنزل و انحطاط میں مبتلا ہے‘ اس کی وجہ تعلیماتِ قرآنی سے لاعلمی اور احکامِ قرآنی کی عدم پیروی کے سوا کچھ اور نہیں‘ باوجود اس کے کہ مسلمانوں کی تعداد بھی کچھ کم نہیں اور ان کے بلاد و امصار بھی دور دراز تک پھیلے ہوئے ہیں۔ ہمارے اسلاف نے اسی قرآن کی برکت سے ترقی کی جو منازل طے کی تھیں‘ تاریخ اس پر حیران رہے گی۔ حالانکہ ان کی تعداد کم تھی‘ قرآن کے نسخے بھی انہیں بسہولت میسر نہ تھے اور حفاظ کرام کی تعداد بھی محدود تھی۔ لیکن ہمارے اسلاف کی ترقی کا راز اسی حقیقت میں پوشیدہ ہے کہ انہوں نے اپنی تمام تر توجہ قرآن کریم کے درس و مطالعہ‘ اس کے بحرِ معانی میں غواصی کرنے اور پھر اس کی پیروی کرنے کی طرف مبذول کی۔ اس ضمن میں انہوں نے اپنی فطری صلاحیتوں‘ عربی زبان و ادب کے شوق اور اپنے ماحول سے بھرپور فائدہ اٹھایا۔ اس کے ساتھ ساتھ حضور اقدس ﷺ نے اپنے اقوال و اعمال اور اخلاق و احوال سے قرآن مجید کی جو تشریح و توضیح کی تھی‘ اس سے اور پھر صحابہ کرامؓ کے اقوال سے بھی خوب کسبِ فیض کیا۔ ؎

گر تو می خواہی مسلمان زیستن
نیست ممکن جز بہ قرآن زیستن

قرآن پاک سلف صالحین کا اوڑھنا بچھونا تھا‘ وہ اسے پڑھتے‘ سمجھتے اور حفظ بھی کرتے۔ اس حوالے سے صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم اور تابعینؒ کے طرزِ عمل کا درج ذیل واقعات سے اندازہ ہو گا۔ مشہور تابعی عبد الرحمٰن سلمی کے بیان کے مطابق حضرت عثمان بن عفان اور حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہما نے انہیں بتایا کہ جب وہ نبی اکرم ﷺ سے دس آیتیں سیکھتے تو اس وقت تک آگے نہیں بڑھتے تھے جب تک کہ ان آیات کی تمام علمی و عملی باتوں کا علم نہ حاصل کر لیتے۔ نیز

حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے یہ قول بھی منسوب ہے کہ مَیں نے سورۃ البقرہ آٹھ سال میں مکمل کی۔ یعنی جتنا حصہ سورت کا پڑھا‘ اسے سمجھا اور اس پر عمل کیا‘ پھر آگے چلے‘ یوں آٹھ سال میں تکمیل ہوئی۔ اسی طرح مشہور تابعی مجاہدؒ سے یہ قول مروی ہے کہ مَیں نے تین مرتبہ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کو بایں طور قرآن پاک سنایا کہ ہر آیت پر ٹھہر کر دریافت کرتا کہ یہ کیسے اور کہاں نازل ہوئی! اسی طرح ابن ابی ملکیہ کا قول ہے کہ مَیں نے دیکھا کہ مجاہد‘ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ سے قرآن کی تفسیر پوچھ رہے ہیں اور ان کے پاس تختیاں بھی ہیں۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ نے کہا کہ لکھتے جاؤ! یہاں تک کہ مجاہد نے مطلوبہ تفسیر لکھ لی۔

قرآن کریم کے ساتھ ایسے ہی تعلق اور اس پر عمل کی برکت سے اُمّتِ مُسلمہ کے ہاتھوں عجائبات کا ظہور ہوا تھا۔ دعوت وتبلیغ اور جہاد کے حوالے سے انہوں نے جدھر کا بھی رخ کیا‘ کامیابی وکامرانی نے ان کے قدم چومے۔ اس دور میں اسلامی دعوت وتبلیغ کی سب سے بڑی رکاوٹ مشرق میں ایرانی بادشاہت اور مغرب میں رومی سلطنت تھی۔ مسلمانوں کے قدموں نے ان دونوں بادشاہتوں کا نام ونشان مٹا دیا۔ ان کے زیر تسلط جو علاقے بھی آئے‘ وہاں کی اکثریت دائرۂ اسلام میں داخل ہوگئی۔ اسلام کے باعمل شیدائیوں نے جس طرف بھی قدم بڑھائے‘ نویدِ فتح ان کے آگے آگے چلتی رہی۔ ایک طرف سرزمین اندلس ان کے گھوڑوں کی ٹاپوں سے گونج رہی تھی تو دوسری طرف ہند کا خطہ ان کی فاتحانہ آمد سے مہک رہا تھا۔ لیکن پھر ایک وقت ایسا آیا کہ مردِ مسلمان کی تلوار کند ہو کے جواب دے گئی اور قرآن پاک سے ان کا عملی تعلق نہ ہونے کے برابر رہ گیا۔ ان کی غالب اکثریت کلام اللہ کو صرف گھروں‘ مسجدوں اور محفلوں میں پڑھنے پر قانع ہوگئی‘ اس کے پڑھنے اور عمل کرنے کو طاقِ نسیاں پر رکھ دیا گیا اور اس کا کہیں بھی رکھا اور پڑھا جانا صرف حصولِ برکت وثواب کے لیے رہ گیا۔ اُمّتِ مُسلمہ نے یہ سبق بالکل بھلا دیا کہ قرآن کریم کی برکت عظمیٰ تو اس کی تلاوت کرنے‘ اس پر غور وثواب فکر کرنے اور اس کی بیان کردہ تعلیمات سے کسبِ فیض کرنے میں پوشیدہ ہے۔ اور یہ حقیقت بھی ان کے ذہن سے بالکل اتر گئی کہ قرآن مجید سے حصولِ خیر اس بات میں مضمر ہے کہ اس کے بتائے ہوئے احکام واوامر پر صدقِ دل سے عمل کیا جائے اور اس کے محرمات ونواہی سے کلی اجتناب برتا جائے۔ دورِ حاضر کے مسلمانوں کی حالت اُس پیاسے کی سی ہے جو پیاس سے مر رہا

ہو' درآنحالیکہ پانی اس کے سامنے پڑا ہو' یا پھر اُس راہ گم کردہ حیوان کی سی ہے جو اندھیرے میں تھکان سے ہلاک ہو رہا ہو اور وہ آنکھ ہی نہ کھولے' درآنحالیکہ چاروں طرف روشنی پھیل چکی ہو' ذٰلِكَ هُوَ الْخُسْرَانُ الْمُبِيْنُ ۔

امام مالکؒ کا قول ہے: لا یصلح آخر هذه الامة الا بما صلح به اولها ''اُمّتِ مُسلمہ کے آخری دور کی اصلاح بھی اسی طرح ہوسکتی ہے جیسے کہ پہلے دور کی ہوئی تھی''۔ اس کا واحد طریقہ یہی ہے کہ قرآن کریم کو پڑھ کر اس سے رشد وہدایت کا پیام اخذ کیا جائے' پھر زندگی کے تمام طور طریقوں کو اسی سانچے میں ڈھالا جائے۔ ہمارے اسلاف کا اوڑھنا بچھونا قرآن مجید ہی تھا۔ وہ اپنے گھروں اور مجالس میں اس کی تلاوت کرتے اور اسی پر غور وفکر کرتے تھے۔ اس کے خوش آئند اثرات ظاہر ہوئے اور وہ پست سطح سے اٹھ کر علم وعمل اور اخلاقِ حسنہ کی بلندیوں پر فائز ہوگئے۔ ساتھ ساتھ وہ مروّجہ علوم وفنون کے بھی ماہر بن گئے اور اس حوالے سے بھی انہوں نے اقوامِ عالَم پر سبقت حاصل کرلی۔ یہ سب کچھ قرآن عزیز کو پڑھنے اور اس کی تفسیر کو سمجھے بغیر ممکن نہیں تھا۔

ان تمام باتوں سے یہ حقیقت آشکار ہوتی ہے کہ تفسیر کی اہمیت وضرورت میں یاددہانی' عبرت آموزی اور عقائد وعبادات نیز معاملات اور اخلاق میں ہدایاتِ خداوندی کا تفصیلی علم ہے' تاکہ ان پر عمل پیرا ہو کر فرد' خاندان اور اُمّتِ مُسلمہ دین ودنیا اور آخرت میں کامیابی وکامرانی سے ہمکنار ہو۔ ورنہ اب تو حال یہ ہے کہ ؎

بجھی عشق کی آگ اندھیر ہے
مسلماں نہیں راکھ کا ڈھیر ہے!

❁❁❁

اپنے ذاتی اوقات میں سے کم از کم نصف گھنٹہ نکال کر ''بیان القرآن'' کے ترجمہ وترجمانی کا ضرور مطالعہ کریں' آپ یقیناً مستفید ہوں گے۔ (ان شاء اللہ!)

بقیہ: عرضِ احوال

سود کے خلاف عدالت نے ۱۹۹۱ء میں فیصلہ دے دیا‘ لیکن اس کے خلاف خود نواز حکومت نے اپیل کر دی۔ اپیل کا فیصلہ ۱۹۹۹ء میں آیا جو کہ پہلے فیصلے کے حق میں تھا۔ لیکن اس کے بعد پھر حکومتی سطح پر کیس کو الجھا دیا گیا اور آخر تنظیم اسلامی‘ جماعت اسلامی اور علماء کی کوششوں سے ۲۰۲۲ء میں وفاقی شرعی عدالت نے سود کے خلاف فیصلہ دے دیا۔

ایسی سینکڑوں مثالیں موجود ہیں کہ ہمارے حکمرانوں خصوصاً سیاسی جماعتوں نے باطل کی ڈکٹیشن اور پیروی کی وجہ سے نہ صرف ہمارے ملک بلکہ ہمارے ایمان‘ نظریۂ پاکستان اور دینِ اسلام سے بھی کھلواڑ کیا۔ چنانچہ اس پوری صورتِ حال میں مذہبی طبقے اور دینی جماعتوں کے لیے لائحۂ عمل واضح تھا کہ وہ باطل کی پیروی کرنے والی اور بیرونی آقاؤں کی ڈکٹیشن پر چلنے والی نام نہاد جمہوری پارٹیوں اور سیاستدانوں سے الگ ہو جاتے‘ کلمہ اور دین کی بنیاد پر خود بھی اپنا الگ راستہ اختیار کرتے اور عوام کے اندر بھی اس حوالے سے شعور و آگاہی کی مہم چلاتے۔ نیز تمام تر سیاسی اور معاشی بحرانوں کا ذمہ داران سیکولر اور باطل کی پیروی کرنے والوں کو ٹھہرا کر عوام کی توجّہ اسلام کے نظامِ عدلِ اجتماعی کی طرف دلاتے اور ان کے اندر نفاذِ اسلام کی ضرورت اور اہمیت کا احساس جگاتے۔ لیکن بدقسمتی سے مذہبی اور دینی طبقے کا بھی ایک بہت بڑا حصہ ان نام نہاد جمہوری پارٹیوں اور کٹھ پتلی سیاستدانوں کے سحر میں گرفتار رہا جس کے نتیجہ میں باطل اور برائی کو مزید طاقت ملی اور ہمارا ملک اور معاشرہ تباہی کے دہانے پر پہنچ گیا۔

اب اس تباہی سے نکلنے کا واحد راستہ یہ ہے کہ مذہبی اور دینی طبقہ اپنے اس طرزِ عمل پر توبہ و استغفار کرے اور باطل کی پیروی کرنے والی سیاسی جماعتوں اور سیاستدانوں سے الگ ہو کر خالص دینی بنیادوں پر تحریک چلائیں تو انہیں کامیابی ملے گی‘ جیسا کہ جب جب دینی جماعتوں نے خلافِ اسلام قانون سازیوں کے خلاف تحریک چلائی ہے تو وہ کامیاب ہوئی۔ قادیانیوں کے خلاف تحریک چلائی تو وہ کامیاب ہوئی۔ اسی طرح سود کے خلاف مہم میں انہیں عدالتی سطح پر اللہ نے کامیابی دی ہے۔ اس لحاظ سے دینی جماعتوں کے بارے میں ایک بات برملا کہی جاسکتی ہے کہ اگرچہ وہ پاکستان میں اسلامی نظام کے حوالے سے کوئی مثبت پیش رفت نہیں کر سکیں‘ البتہ بیرونی دشمنوں اور اُن کے اشاروں پر چلنے والی این جی اوز نے جب بھی پاکستان میں خلافِ اسلام قوانین رائج کرانے کی کوشش کی تو ایسی ہر کوشش دینی جماعتوں کی مزاحمت سے اکثر و بیشتر ناکام ہوئی۔ منکر کے خلاف تحریک ہی وہ واحد راستہ ہے جس پر اگر دینی طبقہ اور دینی جماعتیں چل پڑیں تو کلمہ طیبہ اور ایمان کا تقاضا بھی پورا ہوگا‘ اللہ کی مدد بھی آئے گی‘ نفاذِ اسلام کی جدّوجُہد میں بھی کامیابی حاصل ہوگی‘ ملک میں استحکام اور بہتری بھی آئے گی اور نظریۂ پاکستان کی بھی تکمیل ہوگی۔ ❁❁❁

وہی زمانے کی گردش پہ غالب آتا ہے
جو ہر نفس سے کرے عمرِ جاوداں پیدا

حاملین و وارثینِ قرآن کے نام اہم پیغام

محترم ڈاکٹر اسرار احمدؒ کی تمام تصانیف

اور

مکتبہ خدام القرآن کی دیگر کتابوں پر مشتمل

ہفت روزہ ندائے خلافت' ماہنامہ میثاق اور سہ ماہی حکمتِ قرآن
کے سالِ رواں کے شمارے بھی اَپ لوڈ کر دیے گئے ہیں

موبائل فون ایپلیکیشن Tanzeem Digital Library

گوگل پلے سٹور اور آئی فون ایپ سٹور پر دستیاب ہے

GET IT ON Google Play

ع صلائے عام ہے یارانِ نکتہ داں کے لیے

شعبہ تحقیقِ اسلامی

مرکزی انجمن خُدّام القرآن لاہور

TanzeemDigitalLibrary.com

July 2022
Vol.71

Regd. CPL No.115
No.7

Monthly **Meesaq** Lahore